جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں ۶/ سال

وہ خُلدِ بریں ارمانوں کی

ذیشان احمد مصباحی

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، کشمیر

وہ خلد بریں ارمانوں کی

ذیشان احمد مصباحی

تزئین و کتابت: ظفر عقیل سعیدی

طبع اول: مئی ۲۰۲۲ء/شوال ۱۴۴۳ھ

ضخامت: ۱۳۶/صفحات

قیمت: ۱۰۰/روپئے

ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، کشمیر

Wo Khuld-e-Bareen Armanon Ki

by: Zishan Ahmad Misbahi

Islamic Research Institute, Islamabad, Kashmir

www.iritrust.com +919906400358

اعتراف

جامعہ اشرفیہ کی علمی فضا، اساتذۂ اشرفیہ کی تعلیم وتربیت، احباب اشرفیہ کی رفاقت و معاونت، دہلی کا فکر ساز ماحول، ماہ نامہ جام نور کا آزاد، بے باک، ادبی اور تنقیدی پلیٹ فارم، خانقاہ عارفیہ اور جامعہ عارفیہ کی علمی، تحقیقی اور اخلاقی وسعت وسماحت، فیس بک کی فیض بخشی اور سرعت ترسیل وتاثیر اور آخر میں قاضی احمد یاسر کی محبت، طباعت اور اشاعت، اس بے مایہ تحریر کے منظر عام تک آنے میں ان سب کا رول ہے۔ سب کا شکریہ اور سب کے لیے دل سے دعا۔ محمد علی، صادق رضا مصباحی اور آفتاب رشک مصباحی کا بھی شکریہ جنہوں نے پروف کے بعض اغلاط کی تصحیح فرمائی۔

ذیشان احمد مصباحی

انتساب

پیدائشی درویش

مولانا غلام مصطفیٰ ازھری انعام القادری

عرف

شیخ انعام صفی

کے نام

جو

باغ فردوس

الجامعۃ الاشرفیہ

کے دوران قیام میرے فکری مربی رہے

اور بعد میں بھی ان کے بعض شطحات سے قطع نظر

میں ہمیشہ ان سے استفادہ کرتا رہا

اور وہ میرے ہزار ہفوات کے باوجود مجھے ہمیشہ گوارا کرتے رہے!

ذیشان احمد مصباحی

انتساب

ایک سیمابی نوجوان

فیضان عزیزی

کی نذر

جو

باغ فردوس

الجامعۃ الاشرفیہ

کے بانی حافظ ملت

مولانا عبد العزیز مرادآبادی

کا نواسہ اور میرا خواجہ تاش ہے

اور جس کے اندر میں حافظ ملت کا جنون پاتا ہوں!

ذیشان احمد مصباحی

مشمولات

پس منظر	پردہ اٹھتا ہے	۷
پہلا منظر	قصۂ ناتمام	۹
دوسرا منظر	رقصِ جنوں	۱۲
تیسرا منظر	اسٹرائک	۱۵
چوتھا منظر	نظامِ عمل	۲۴
پانچواں منظر	کلاس روم	۳۰
چھٹا منظر	کلاس روم-۲	۳۸
ساتواں منظر	رندانِ خرابات	۴۳
آٹھواں منظر	دھنک رنگ	۵۰
نواں منظر	معمولات	۵۷
دسواں منظر	بہارِ ادب	۶۲
گیارہواں منظر	فلاپ شو	۶۸
بارہواں منظر	مجلسِ قضا	۷۳
تیرہواں منظر	آتشِ امتحان	۷۹
چودہواں منظر	انقلابِ نظر	۸۸
پندرہواں منظر	عہدِ واثق	۹۶
سولہواں منظر	فَقَد کَفَر؟	۱۰۸
سترہواں منظر	معروضات	۱۱۸
اٹھارہواں منظر	اگلا پڑاؤ	۱۲۴
پیش منظر	پردہ گرتا ہے	۱۲۷
تاثرات	قارئین کی آرا	۱۲۹

پس منظر

پردہ اٹھتا ہے!

اشرفیہ میرے خوابوں کا شہر ہے۔ یہیں میرے فکر وشعور کو بال و پر نکلے۔ اس کے درودیوار سے ہم آغوش ہونے کی آرزو میرے تحت شعور میں پیوست تھی، جو حق تعالیٰ کی عنایت سے ۱۹۹۹ء میں پوری ہوئی۔ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۴ء تک کل ۶/سال میں نے اس خاک کے بوسے لیے۔ باغ فردوس (۱) کے انہی گلی کوچوں میں میں نے دین ومسلک اور قوم وملت کا شعور پایا۔ حق تعالیٰ کی عطا کردہ اس چھوٹی زندگی کو انہی ایام نے سمت سفر بخشا۔ انہی دنوں میں نے پڑھنا، سمجھنا، سوچنا، لکھنا اور سوال کرنا شروع کر دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ میں نے انہی ایام میں علم وعقیدہ اور فکر ومسلک - کی درست تعبیر کی حفاظت کے ساتھ

---

(۱) ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء میں مبارک پور کے غریب مسلمانوں نے اسے **مدرسہ مصباح العلوم** کے نام سے قائم کیا۔ اس وقت دیوبندی بریلوی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

۳۰/۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء میں مدرسہ مصباح العلوم کی نشاۃ ثانیہ ہوئی تو بہادر شاہ ظفر کی اولاد میں ایک تارک الدنیا بزرگ شاہ عبداللطیف چشتی سلطان پوری کے ایک مرید مولانا محمد عمر لطیفی مبارک پوری اور سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی کے مریدین کی خواہش کے مطابق اس کا نام ''**مدرسہ لطیفیہ اشرفیہ مصباح العلوم**'' تجویز کیا گیا۔

یہ ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۵ء کا سال تھا جب حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز مرادآبادی (۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) اور ان کے احباب نے گولہ بازار مبارک پور میں ایک وسیع زمین حاصل کی، **دارالعلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم** کا سنگ بنیاد رکھا اور **باغ فردوس** (۱۳۵۳ھ) کے تاریخی نام سے اسے موسوم کیا۔

۵/۶/۷/مئی ۱۹۷۲ء کو تاریخ ساز تعلیمی کانفرنس ہوئی، جس کے بعد قصبہ مبارک پور سے باہر جنوب کی طرف سٹھیاؤں روڈ پر ایک وسیع وعریض قطعۂ آراضی پر **الجامعۃ الاشرفیہ** کی تعمیر شروع ہوگئی۔ یہ اب بھی مائل بہ عروج ہے۔

-ان کے ان محبوس گھروندوں کو مسمار کر دیا تھا جنہیں بالعموم مسلکی جھنڈا بردار تا حیات اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر مادر علمی کا یہ سب سے بڑا احسان ہے جس کے بوجھ سے میری پشت ہمیشہ خمیدہ رہے گی۔

جامعہ اشرفیہ مبارک پور کا نام ملک کے صف اول کے مدارس میں آتا ہے۔ مزید یہ کہ حریت ومعقولیت، جرأت ونخوت، قیل وقال، بحث ومناظرہ اور مزاح اور جملے بازی، وغیرہ ایسے پہلو ہیں جن میں شاید ہی ملک کے کسی بڑے مدرسے کی فضا، اشرفیہ کے ساتھ دعوئ ہم سری کرے۔ پیش نظر روداد سفر میں ان کی جھلکیاں موجود ہیں۔

اشرفیہ کے اس ۶/ سالہ سفر میں کسی عالم وفلسفی کی حکمت ودانائی اور ادیب وشاعر کی سخن گستری اور نکتہ سنجی نہ سہی، البتہ اس میں تربیت وتعلیم ،لہو وتفریح ،فکر وتدبیر، اساتذہ کی کرم نوازی، احباب کی زندہ دلی، رزم وبزم کی محاذ آرائی ،فکر وخیال کی بلند پروازی، خوش گپیاں اور شرارت انگیزیاں، جیسے وہ سارے پہلو موجود ہیں، جو کسی بھی بڑے دینی مدرسے میں پڑھنے والے طالب علم کی زندگی میں ہو سکتے ہیں۔ اس سفر کے دروبست سے وہ تمام دینی ومسلکی اور ثقافتی وسماجی تانے بانے تلاش کیے جا سکتے ہیں جن کو جوڑ کر کل کا مورخ آج کے مدرسوں کے مسلک ومنہاج کو بہ آسانی سمجھ سکے گا۔

عہد طالب علمی میں ہی ان ایام مستی وخم خواری کو قلم بند کرنے کا خیال پیدا ہو چکا تھا۔ فروری/ مارچ ۲۰۱۸ء میں اسے قلم بند کیا۔ روزانہ لکھتا اور فیس بک پر نشر کر دیتا۔ اب یہ روداد کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

پہلا منظر

قصۂ ناتمام

’’کہاں سے اور کیسے آنا ہوا؟ حضرت نے بڑی محبت اور متانت سے دریافت کیا۔

میں محمد آباد سے آرہا ہوں۔ فیض العلوم کا طالب علم ہوں۔

جی! فرمائیے! کیا حکم ہے؟

حضور! میں اگلے سال آپ کے ادارے میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے ادارے کا بڑا شہرہ ہے۔ ابھی ہمارے یہاں شعبان کی چھٹی ہوئی ہے۔ سوچا گھر جانے سے پہلے حضور سے نیاز حاصل کرلوں اور اگلے سال یہاں آنے کی اجازت لے لوں۔

کہاں کے رہنے والے ہیں؟ اور کیا پڑھتے ہیں؟

میں درجۂ مولوی کا طالب ہوں اور بہار کے پس ماندہ علاقے چمپارن کا رہنے والا ہوں۔

حضرت نے میری گزارش کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرلیا۔ ماحضر سے ضیافت فرمائی۔ تھوڑی دیر دین اور سماج کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں اجازت لے کر الٹے پاؤں واپس ہوگیا۔

حضرت سے مل کر جب واپس ہوا تو ذہن و دماغ کا عجب عالم تھا۔ میری نس نس میں آرزوؤں اور امنگوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ فرط انبساط میں آنکھیں نم تھیں اور سوزش عشق سے سینہ پھٹا جارہا تھا۔ آج جاگتی آنکھوں سے اپنے مستقبل کا حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ تابناک علمی و تعلیمی مستقبل کا تانا بانا سلجھاتا ہوا گھر پہنچا اور اپنے دوستوں اور والدین کو

اپنے عزائم سنائے۔سوچتا تھا کہ شعبان سے شوال تک کی دو ماہ کی یہ مسافت کتنی جلد طے ہوجائے، کہ میں اپنے خوابوں کے شہر کی سیر کروں۔ چند روز بھی نہ گزرے کہ سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔عزائم دھرے کے دھرے رہ گئے۔ والدین نے آناً فاناً میری شادی کر ادی۔ میں نے تعلیم کا سلسلہ روک دیا اور ازدواجی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ گیا۔

مولانا محمد احمد مصباحی (۱) میرے ساتھیوں میں ہیں۔فیض العلوم کے زمانۂ تعلیم میں چھٹیوں میں، میں ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ میرے والد کی طرح خود ان کے والد بھی ایک کسان آدمی تھے۔ مولانا مصباحی زمانۂ طالب علمی ہی سے نہایت کم آمیز ہیں۔ پڑھائی سے کام، رات میں دیر تلک کسی کونے میں چراغ جلائے اکیلے بیٹھے مطالعے میں مصروف رہتے۔مدرسے کے شور وشغب کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔فیض العلوم سے وہ اشرفیہ چلے گئے اور میری تعلیم وہیں رک گئی۔

حافظ ملت کا وہ نورانی چہرہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ دبلا پتلا بدن، سروقد، چہرے پر بشاشت اور عزیمت کے آثار، لب پر تیرتی مسکراہٹ، آنکھوں میں استقلال اور اعتماد کی لکیریں، آواز ہلکی مگر باوزن۔افسوس کہ یہ خواب خواب ہی رہ گیا۔ یہ ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء کی بات ہوگی۔''

والد گرامی یہ قصہ بارہا مجھے سنا چکے ہیں۔اس قصے کے پیچھے ان کا مقصد ماضی کے غم کا بیان بھی ہے اور حال کی ایک خوشی کا اظہار بھی۔کیا عجب وہ مجھے اپنے ٹوٹے خوابوں کی تعبیر نو سمجھتے ہوں۔

جامعہ اشرفیہ کا نام میرے شعور کے کانوں میں اس وقت آیا جب میں درجۂ اعدادیہ کا طالب علم تھا۔ یہ ۱۹۹۶ء کا سال رہا ہوگا۔مدرسے میں درجۂ عالمیت کے طلبہ بھی تھے۔ وہ کہیں بیٹھے اپنی اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے اشرفیہ میں داخلے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ان کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ وہ ایسا ادارہ ہے جہاں داخلہ آسان نہیں ہے اور جس کا داخلہ ہو گیا تو سمجھو علم و

---

(۱) مولانا محمد احمد مصباحی (ولادت: ۱۹۵۲ء) جامعہ اشرفیہ کے سابق پرنسپل اور موجودہ ناظم تعلیمات ہیں۔کئی مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔

عرفان سے اس کا ایک گہرا رشتہ قائم ہو گیا۔ وہاں کے فارغین علمی طور پر بھی پختہ اور نمایاں ہوتے ہیں اور معاشرتی زندگی میں بھی بڑی عزت و توقیر پاتے ہیں۔ وہ ایک مدرسہ نہیں ایک شہر ہے۔ تا حد نگاہ اس کی عمارتوں کا سلسلہ دراز نظر آتا ہے۔ یہ اور اس قسم کی باتیں سننے کے بعد سینے میں امنگوں نے انگڑائی لی۔ کسی نے ہولے سے سرگوشی کی۔ میں علم جہاں بھی حاصل کروں، کم سے کم آخری سال اس ادارے میں ضرور جاؤں گا اور کسی بھی درجے سے کامیاب ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ خوابوں کا یہ شہر کہاں واقع ہے اور وہاں جانے کی سبیل کیا ہے۔ بس اتنا جانتا تھا کہ جب بڑا ہو جاؤں گا تو معلوم کر لوں گا۔

رقص جنوں

آج صبح ہی سے جامعہ کی سینٹرل بلڈنگ کے نیچے اور سامنے سڑکوں پر طلبہ اور ان کے سرپرستوں کا ہجوم ہے۔ یہاں آئے ہوئے تین چار روز ہو چکے ہیں۔ صبح سے کئی بار میں بھی سینٹرل بلڈنگ کا طواف کر چکا ہوں۔ دراصل آج داخلہ ٹیسٹ کا رزلٹ آنا ہے۔ لیکن معصوم جذبوں کا یہ حال، جیسے وہ نامۂ اعمال پانے کے منتظر ہوں۔ سینٹرل بلڈنگ کے وسط میں دفاتر ہیں۔ ان کے اوپر ایک وسیع ہال ہے جو دارالحدیث کے نام سے مختص ہے۔ یہ پورا ہال ایک بلند و بالا سبز گنبد کے سائبان میں ہے۔ جانب مشرق ٹھیک سامنے اشرفیہ کا مین گیٹ ہے۔ دونوں طرف سبز پارک ہیں۔ سڑک کی دوسری طرف چائے خانے ہیں۔ میں وہیں بیٹھا کبھی گنبد کو دیکھتا ہوں تو کبھی اس کے نیچے کھڑے ہجوم کو، جو رزلٹ کا منتظر ہے۔ جب گنبد کو دیکھتا ہوں تو کانوں میں ایک آواز سنائی دیتی ہے کہ یہ سبز گنبد سائز میں شاید تاج محل کے سفید گنبد کے برابر ہو، لیکن اثر و نتیجے کے اعتبار سے تو یقیناً اس سے بہت بڑا ہے۔ اُس کے گرد سیاحوں کا ہجوم ہوتا ہے، جب کہ اس کے نیچے علم کے ننھے مسافر کھڑے ہیں جو بہت دور تک چلنے کا عزم رکھتے ہیں۔ تاج محل کا گنبد مسلمانوں کے ماضی کی شان و شوکت کی کہانی سناتا ہے لیکن یہ گنبد مسلمانوں کے دینی و علمی مستقبل کی تعمیر کے لیے نوید جاں فزا دے رہا ہے۔ میرا وجود ٹوٹتا بکھرتا جا رہا ہے اور اس گنبد کی تزئین و بلندی میں جذب ہوتا اور سمٹتا جا رہا ہے۔ لیکن جوں ہی نظر نیچے پڑتی ہے تو امید و یاس کی کشمکش میں گھر جاتا ہوں۔ کامیاب ہو گیا تو اس جنت ارضی میں جینے کا کیا ہی لطف ہوگا،

لیکن اگر نا کام ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ اس سوال کا کوئی جواب ذہن میں نہیں ہے، نہ اس پر غور کرنے کی جرأت ہے۔

یکا یک ہجوم گنبد کے نیچے سامنے دیوار کی طرف بھاگتا دکھائی دیا۔ کچھ آوازیں بھی بلند ہوئیں۔ سڑک کی دوسری طرف چائے خانوں میں بیٹھے لوگ بھی اس طرف لپکے۔ میں بھی ان کے پیچھے بھاگا۔ مطلب صاف تھا کہ ہمارا نامۂ اعمال دیوار پر آویزاں کر دیا گیا ہے۔ میرے ساتھ داخلے کے امیدوار جناب غوث الرحمن ابن مولانا خلیل الرحمن بھی تھے جو اتفاق سے میرے ہی گاؤں کے ہیں۔ دونوں نے ساتھ ہی میں درخواست دی تھی اور ٹیسٹ میں بیٹھے تھے۔ بڑی مشکل سے جب میں دیوار کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ مولانا غوث الرحمن کامیاب ہیں۔ ان کے نیچے والی لائن میں ''نا کام'' کا لفظ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہونے کو ہی تھے کہ دیکھا میرے اور ان کے نام کے بیچ ایک تیسرا نام بھی ہے جو نا کام ہے اور اس کے نیچے میں کامیاب ہوں۔ اندرون میں رقص کی سی کیفیت پیدا ہوگئی، لیکن میری نگاہوں کے سامنے بہت سے چہرے وہ بھی تھے جو سخت مایوس تھے اور ان میں بعض وہ بھی تھے جو اپنے آنسو پونچھ رہے تھے۔ یہ نا کام ہونے والے طلبہ تھے۔ اشرفیہ میں داخلے کے جوش وخروش کے حوالے سے یہ میرا اپنا تجربہ ومشاہدہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیگر فرزندان اشرفیہ نے بھی اس سے ملتے جلتے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا اور وہ میری تصدیق کریں گے۔

سنی بریلوی مسلمانوں کے بیچ اس تعلیمی ادارے کی حیثیت کیا ہے اور اس میں داخلہ مل جانا سنی طلبہ کے لیے کتنا اہم ہے، مذکورہ سطور کے تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں داخلہ رزلٹ آؤٹ ہونے کے وقت بہت سے دیگر مدارس کے ذمہ داران اس امید میں جلوہ افروز ہوتے ہیں کہ اشرفیہ کے داخلہ ٹیسٹ میں نا کام ہونے والے طلبہ ان کے مدارس کو زینت بخشیں گے۔ وہ یہاں داخلہ ٹیسٹ میں نا کام ہونے والے طلبہ کو بصد اعزاز وافتخار اپنے مدارس میں لے جاتے ہیں۔ لیکن اشرفیہ میں تعلیم کے حوالے سے بعض طلبہ اتنے جذباتی ہوتے ہیں جو اس نا کامی کے بعد سرے سے تعلیمی سفر کو ہی موقوف کر دیتے ہیں۔

یہ ۱۹۹۹ء کا سال تھا۔ میرا تعلیمی سفر شوق ووارفتگی اور خاموشی وتیزی کے ساتھ جاری تھا۔ اشرفیہ کے ڈیڑھ ہزار طلبہ میں، میں ایک نامعلوم طالب علم تھا۔ شروع ہی سے

میں پڑھنے میں لگ گیا تھا اور میں ہی نہیں، تمام نئے طلبہ کا یہی حال تھا۔لیکن یہ عمل اس وقت کے اشرفیہ کے داخلی تعلیمی کلچر کے خلاف تھا۔اشرفیہ کی تعلیمی ثقافت اُن ایام میں ذی الحج کے بعد اپنا رنگ دکھاتی تھی۔شوال سے ذی الحج تک دو ماہ کا دورانیہ قدیم طلبہ کے لیے کھیل کود، تفریح وشرارت، گپ شپ اور چیخوں اور قہقہوں کے لیے وقف تھا۔ مجھے یاد ہے اور بعض ہمارے سینئر ساتھیوں نے بھی مجھے یاد دلایا کہ میری خاموشی اور سنجیدگی کو دیکھ کر بہت سے قدیم طلبہ میری خاص رعایت کرتے اور بسا اوقات صرف اس لیے کہ میں ڈسٹرب نہ ہوجاؤں ''لُوڈو'' اور قہقہوں کی مجالس اٹھا کر دوسرے کمروں میں چلے جاتے۔ بقرعید بعد سے ہاسٹل کے تعلیمی کلچر میں بیداری آتی جو محرم آتے آتے اپنے شباب کو پہنچ جاتی ۔لیکن افسوس کہ اس سال یہ بیداری نہیں آئی۔وہ سال اسٹرائک کے شور وشغب کی نذر ہوگیا۔اب کچھ اس کی داستان بھی سنتے چلیے۔

تیسرا منظر

اسٹرائک

اسی سال جامعہ اشرفیہ کے ارباب حل وعقد نے جامعہ کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے اور خصوصاً درجۂ فضیلت کے طلبہ کو جشن فضیلت کی جگہ تعلیم فضیلت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایک نئے قانون کو منظوری دی۔ اس قانون کے مطابق درجۂ فضیلت کے صرف انہی طلبہ کو دستار ملنی تھی جو شش ماہی امتحان پاس کریں۔

یہ قانون فی نفسہٖ اچھا ہوتے ہوئے بھی بظاہر بعض طلبہ کے خلاف جا رہا تھا۔ طلبہ نے اس قانون کو اصلاحی قانون کے بجائے تفریقی قانون کے طور پر دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہم کیسے گوارہ کرلیں کہ ہمارے سروں پر فضیلت کا تاج رکھا جائے اور ہمارے ہی ساتھی جو آٹھ آٹھ دس دس سالوں سے ہمارے ساتھ ہیں، اس نعمت سے محروم رہیں۔ دستار ہوگی تو سب کی ہوگی، بصورت دگر کسی کی نہیں ہوگی۔ اپنے موقف کی درستگی پر ان کا ایک استدلال یہ بھی تھا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ شش ماہی میں کسی کتاب میں فیل ہونے والا طالب سالانہ امتحان پاس کر جائے اور ایسا کامیاب طالب علم بھی اس تازہ قانون کی سیاہی سے اپنا چہرہ نہ بچا پائے۔

طلبہ نے ذمہ داران سے مفاہمت کی کوشش کی، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا، بالآخر ایک دن درجۂ فضیلت کے طلبہ نے کلاسیز کا بائیکاٹ کر دیا اور اپنی جذباتی تقریروں سے دیگر طلبہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ طلبہ نے اندر سے ہاسٹل مقفل کرلیا اور ہلڑ بازیاں شروع ہوگئیں۔

اُدھر اساتذہ اپنی درس گاہوں میں بیٹھے منتظر تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے کچھ باہر نکل آئے کہ معاملے کو سمجھیں۔ جب اساتذہ کو مسئلے کا ادراک ہوا تو مولانا زاہد سلامی اور چند دیگر اساتذہ طلبہ کو سمجھانے کے لیے ہاسٹل تشریف لائے۔ کچھ دیر تک اسٹرائک کے لیڈروں کے ساتھ گفتگو کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ چوں کہ اساتذہ کی تمام باتوں کے بالمقابل طلبہ کی صرف ایک بات تھی کہ پہلے اس نئے قانون کی منسوخی کا اعلان کیا جائے۔ اس کے بعد بھی بعض اساتذہ آئے اور سمجھانا چاہا لیکن ان کی گفتگو بھی بے نتیجہ رہی۔ اِدھر وقفے وقفے سے اسٹرائک کے زعما کی پرجوش تقریریں ہوتی رہیں اور انہوں نے اپنی جادو بیانی سے تقریباً تمام طلبہ کو یہ باور کرادیا کہ اشرفیہ کا یہ قانون سراسر ظالمانہ قانون ہے، اگرچہ میرے لیے ان کا یہ فلسفہ اب بھی ناقابل فہم تھا۔ ممکن ہے کہ مجھ جیسے اور بھی طلبہ رہے ہوں لیکن نقارخانے میں طوطی کی آواز سنی کب جاتی ہے اور یہ نقارخانہ تو ایسا تھا کہ وہاں طوطی کا بولنا آفت جان کو دعوت دینا تھا۔

قریب ۱۱ر بجے حضرت مصباحی صاحب اور مفتی نظام الدین صاحب چند دیگر اساتذہ کے ساتھ اتمام حجت کے لیے تشریف لائے۔ درجۂ فضیلت کے انتہائی طرار اور چرب زبان طالب علم جناب احتشام طلبہ کی نمائندگی کررہے تھے۔ عزیزی ہاسٹل کی دوسری منزل کی چھت پر کھلے آسمان کے نیچے یہ مفاوضہ (negotiation) جاری تھا۔ احتشام بھائی کا استدلال تھا:

''حضور حافظ ملت کے زمانے سے اب تک کامیاب اور ناکام، تمام طلبہ کو دستار دی جاتی رہی ہے، پھر آج نیا قانون کیوں؟ کیا جامعہ کے موجودہ منتظمین حضور حافظ ملت اور دیگر اسلاف سے زیادہ منتظم و دانا ہوگئے ہیں؟''

''نئے قانون کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ نئے لوگ پرانے لوگوں کے بالمقابل زیادہ دانش مند ہوگئے ہیں، بلکہ جوں جوں فساد بڑھتا رہتا ہے، اس کے مطابق اصلاح کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ پہلے فضیلت کے طلبہ زیادہ محنت سے پڑھتے تھے اور ان کا رزلٹ بہتر ہوتا تھا، اب فضیلت میں آتے ہی بہت سے طلبہ تعلیم کی طرف توجہ کم کردیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا نتیجۂ امتحان بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ آج کی سی صورت حال پہلے نہ تھی، اس

لیے آج ایک ایسا قانون منظور کیا گیا ہے جو پہلے نہ تھا۔ یہ آپ حضرات کے حق میں ہے، آپ کے خلاف نہیں ہے۔ ذمہ دارانِ ادارہ کو آپ سے کوئی دشمنی نہیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں:

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بے لباس ہوتا ہے، پھر اسے کپڑا پہنایا جاتا ہے اور بڑے ہونے کے بعد وہ لباس کا پابند ہوجاتا ہے۔ اب وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں بچپن میں بے لباس تھا تو اب بھی ویسے ہی رہوں گا۔'' حضرت مفتی صاحب نے بہت سنجیدگی سے تفہیم کی کوشش کی۔

''اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ اس بچے کو ماڈرن فیشن کا لباس پہنا دیا جائے۔'' احتشام بھائی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ طلبہ اس جواب پر بہت خوش ہوئے گو کہ یہ جواب بھی میری سمجھ سے پرے تھا۔

حضرت مصباحی صاحب نے مفتی صاحب سے فرمایا:

''ہم اتمام حجت کے لیے آئے تھے، وہ ہوگیا، چلیے، مزید گفتگو کا کوئی فائدہ نہیں۔'' اساتذہ کا یہ وفد بھی بلا نتیجہ واپس ہوگیا۔

طلبہ کا واحد مطالبہ تھا کہ جب تک یہ نیا قانون منسوخ نہیں ہوجاتا، ہم درس گاہ میں نہیں جائیں گے۔ اُدھر ذمہ داران ادارہ اپنے فیصلے پر اٹل تھے۔ خبر یہ بھی ملی کہ طلبہ کو رام کرنے کے لیے بعض اساتذہ نے کھانا بند کرنے کی تجویز پیش کی تھی، لیکن حضرت مفتی شریف الحق امجدی مرحوم (۱)، جو اس وقت حیات تھے، انہوں نے یہ کہہ کر اس تجویز کو سختی سے مسترد کردیا کہ اس کی وجہ سے طلبہ مزید ہنگامہ کریں گے۔

ہزار کوشش کے باوجود جب طلبہ اور انتظامیہ کے بیچ مفاہمت کی کوئی راہ نہیں نکلی تو بہت سارے طلبہ خاص طور سے جماعت سابعہ کے طلبہ ایک شب بعد نماز عشا روضۂ حضور حافظ ملت پر جمع ہوئے اور لائٹ آف کرکے رو رو کر اجتماعی دعائیں کیں۔ اللہ کا کرنا

---

(۱) شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی (۱۹۲۱-۲۰۰۰ء) گھوسی مئو کے رہنے والے تھے۔ نزہۃ القاری شرح صحیح البخاری، اشک رواں، اسلام اور چاند کا سفر وغیرہ آپ کی اہم تصنیفات ہیں۔

دیکھیے کہ وہ پر کیف آہ وفغاں باب اجابت سے ٹکرائی اور دوسرے ہی دن علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب(۱) سے طلبہ کا رابطہ ہوا اور اسٹرائک کے خاتمے اور طرفین کے بیچ مفاہمت کی سبیل پیدا ہوگئی۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب ان دنوں پرنسپل تھے، لیکن عملاً حضرت مصباحی صاحب ہی پرنسپل کی تقریباً تمام ذمہ داریاں ادا کرتے تھے۔ ان دنوں علامہ طلبہ میں سب سے زیادہ محبوب تھے، جب کہ اس کے برعکس مصباحی صاحب کو تمام نئے نئے قوانین اور پابندیوں کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا، گو کہ بعض ذہین طلبہ کا یہ بھی ماننا تھا کہ گولی علامہ صاحب ہی چلاتے ہیں، گو بندوق مصباحی صاحب کے کندھے پر ہوتی ہے۔

اشرفیہ میں جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، علامہ صاحب ساؤتھ افریقہ کے دورے پر تھے۔ طلبہ کو اب ان سے ہی کچھ امید رہ گئی تھی۔ اچانک ایک دن خبر ملی کہ آج شام علامہ صاحب فون پر طلبہ سے بات کریں گے۔ عشا بعد مین گیٹ کے سامنے واقع عراقی پی سی او پر طلبہ کا ایک بڑا ہجوم علامہ صاحب کے فون کے انتظار میں تھا۔ سب کے کان فون کی گھنٹی پر لگے ہوئے تھے۔ جب بھی فون کی بیل بجتی، طلبہ پر خوشیوں کی ایک لہر آتی اور پھر غائب ہوجاتی۔ خدا خدا کر کے علامہ صاحب کا فون آیا۔ اسپیکر آن کر دیا گیا۔ علامہ نے طلبہ کو یقین دلایا: ''آپ حضرات کلاس کریں، میں آرہا ہوں، ان شاء اللہ! دستار سب کی ہوگی۔''

زعماے احتجاج کے شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا:

''اس سلسلے میں کسی کا خارجہ نہ خود میں کروں گا، نہ کسی کو کرنے دوں گا۔''

---

(۱) مولانا ضیاء المصطفیٰ قادری (ولادت: ۱۹۳۵ء) بریلوی جماعت کے ممتاز عالم دین، خطیب، مدرس اور مناظر ہیں۔ محدث کبیر کے لقب سے معروف ہیں۔ آپ مصنف بہار شریعت مولانا امجد علی اعظمی کے صاحب زادے اور بانی اشرفیہ مولانا عبدالعزیز مرادآبادی کے خاص تلامذہ میں ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں نائب شیخ الحدیث کی حیثیت سے اشرفیہ میں استاذ مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۴ء سے ۲۰۰۰ء تک اشرفیہ کے پرنسپل رہے۔ آپ شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے منصب پر بھی جلوہ افروز رہے۔ ۲۰۰۳ء میں بعض اسباب کے تحت اشرفیہ سے مستعفی ہوگئے اور اب اپنے قائم کردہ ادارہ جامعہ امجدیہ گھوسی مئو میں شیخ الحدیث ہیں۔ سخت گیر بریلوی حلقے کے پیشوا ہیں اور مولانا اختر رضا خان ازہری (وفات: ۲۰۱۸ء) کے بعد اس حلقے میں سب سے زیادہ مقبول ہیں۔

علامہ کی یہ بات سنتے ہی جوش مسرت میں طلبہ نے نعرہ ہائے تکبیر و رسالت بلند کر دیے۔اس طرح اسٹرائک اپنے انجام کو پہنچی اور درسگاہیں پھر سے شروع ہوگئیں۔ دوسرے یا تیسرے دن صبح کو جب علامہ صاحب اشرفیہ پہنچے تو طلبہ نے ان کا تاریخی استقبال کیا۔ مین گیٹ پر واقع مہمان خانے سے لے کر حافظ ملت کے روضے تک طلبہ دو رویہ کھڑے تھے۔ دست بوسی، گل پاشی اور نعرہ ہائے تکبیر و رسالت کی جلو میں یہ کارواں، روضۂ حافظ ملت پہنچا، جہاں علامہ نے فاتحہ پڑھی اور طلبہ کے حق میں دعائیں مانگیں۔

اشرفیہ کی فضا میں سکون کے چند اَیام بھی نہ گزرے کہ ایک دوسری آفت آن پڑی۔ بعض اساتذہ کی شان میں سب وشتم اور بدتمیزی کی پاداش میں دو طلبہ(۱) کا خارجہ ہوگیا۔ اسٹرائک کے لیڈروں نے اس کو اس طور پر لیا کہ انتظامیہ ایک ایک کر کے مختلف بہانوں سے لیڈران کا اخراج کر دے گی اور پھر آسانی سے دوبارہ اس ''ظالمانہ قانون'' کا نفاذ ہو جائے گا۔ پھر کیا تھا، درس گاہوں کا پھر سے بائیکاٹ کر دیا گیا اور عزیزی ہاسٹل کے سامنے پارک میں اور ہاسٹل کے اندر دونوں صحنوں میں انتظامیہ کے خلاف تقریریں شروع ہوگئیں۔ اساتذہ نے اس بار بھی افہام وتفہیم کی کوششیں کیں اور طلبہ کے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا چاہا، مگر اس بار بھی ساری کوششیں بے نتیجہ رہیں۔ واضح رہے کہ اس بیچ ہر جماعت کے طلبہ نے ایک حلف نامہ بھی تیار کیا جس پر اس جماعت کے طلبہ نے دستخط کیے۔ طلبہ کا جنون دیکھ کر میں سوچتا تھا کہ یا تو میں پاگل ہوں، یا یہ سب پاگل ہیں۔

یہ سوچ کر بڑا رنج ہوتا تھا کہ میں یہاں کتنی مشکلوں سے پڑھنے آیا اور یہاں کس تماشے میں پھنس گیا۔ ہر جماعت کے جو سرکردہ طلبہ ہوتے وہ اپنی جماعت کے طلبہ سے حلف نامے پر دستخط لیتے۔ حلف نامے کا مضمون کچھ یوں تھا کہ اگر اس اسٹرائک کی وجہ سے کسی کا خارجہ ہوا اور میں نے اس جنگ میں اپنے بھائیوں کا ساتھ نہیں دیا تو جب جب نکاح کروں تو میری بیوی پر تین طلاق۔

---

(۱) کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں طلبہ شمس العلوم گھوسی میں بیٹھ کر صدر شعبۂ افتا شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ (۲۰۰۰ء) کی شان میں نازیبا کلمات کہہ رہے تھے، جس کی شکایت وہاں کے دوسرے طلبہ نے اشرفیہ کے ارباب حل وعقد تک پہنچائی تھی۔

لیڈروں کی جرأتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ وہ اپنی تقریروں میں یہاں تک کہہ دیتے کہ اشرفیہ کی اسناد کو جلا کر ہم اپنے والد کو ایک کپ چائے بھی نہیں پلا سکتے۔ ذرا سوچو! اگر ہم میں سے کسی نے اپنے دوستوں کا ساتھ چھوڑا اور حلف نامے کی خلاف ورزی کی تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ وہ ہمیشہ کے لیے بیوی کی اس مسکراہٹ سے محروم ہو جائے گا، جسے دیکھ کر دن بھر کا تھکا ہارا انسان، اپنی ساری تکان بھول جاتا ہے۔

ہماری جماعت/ثالثہ (۱) کے حلف نامے پر دستخط کرانے کا فریضہ جناب عارف اقبال، محترم سرفراز اور دیگر حضرات انجام دے رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا پارہ ہائی ہو جاتا۔ انہوں نے مختلف مواقع پر کئی بار مجھ سے پوچھا:

''جی مولانا! آپ نے دستخط کر دیا؟''

جی کرتا تھا کہ میں بول دوں: ''جا میں نہیں کرتا! جو کرنا ہے سو کر لو۔'' لیکن اس جواب کے بعد میری جو ضیافت ہو سکتی تھی، اس کا مجھے ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا۔ اس لیے میں نے ہر بار پُر اعتماد لہجے میں یہ سفید جھوٹ بولنے میں ہی عافیت سمجھی: ''جی ہاں! میں نے کر دیا ہے۔ آپ دیکھ لیں۔'' اور ہر بار موصوف میرے اعتماد پر اعتماد کر لیتے اور از خود لسٹ میں میرے دستخط کو دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے۔

احباب یہ سن کر ہنسیں گے کہ کل جب میں نے مولانا عارف اقبال کو بتایا کہ اسٹرائک کے عہد کی آپ کی شرارتیں قلم بند ہو رہی ہیں اور میں یہ لکھ رہا ہوں کہ کس طرح میں نے آپ لوگوں کے شر سے خود کو بچایا تھا تو وہ قہقہے کے ساتھ کہنے لگے کہ دستخط تو میں نے اور سرفراز نے بھی نہیں کیے تھے۔ جب ایک ساتھی نے دریافت کیا: ''ابے! تم لوگوں کے دستخط کہاں ہیں؟'' تو سرفراز نے جواب دیا: ''بوکا ہو گا؟ ہم لوگ ذمہ دار ہیں نا، ذمہ داران کے دستخط سب سے آخر میں نیچے ہوتے ہیں۔ ہم سب سے بعد میں کریں گے۔ چل پہلے تو کر۔'' اس طرح ہم نے اور سرفراز نے شام کی مسکان سے آنکھیں چار کرنے کا پہلے سے انتظام کر لیا تھا۔

---

(۱) مدارس میں عربی دینی تعلیم کی عام طور سے آٹھ کلاسیز ہوتی ہیں، جنہیں جماعت اولیٰ، ثانیہ، ثالثہ، رابعہ، خامسہ، سادسہ، سابعہ اور فضیلت کہا جاتا ہے۔ دیوبندی مدارس میں انہیں زیادہ تر عربی اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم، ہفتم اور دورہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

اسٹرائک کا یہ سلسلہ دراز ہوتا جارہا تھا اور صورت حال دن بہ دن بگڑتی جارہی تھی۔ آخر ایک دن پھر علامہ ضیاء المصطفیٰ آگے آئے اور تصفیہ کی کوشش کی۔ موصوف نے جمعہ کے دن عزیز المساجد کے منبر سے یہ اعلان کیا کہ دو طلبہ کا جو اخراج ہوا ہے، وہ اسٹرائک میں ان کی شمولیت کے سبب نہیں ہوا ہے، بلکہ بعض اساتذہ کی شان میں صریح گستاخیوں کی پاداش میں ہوا ہے۔ اس اسٹرائک کی وجہ سے نہ کسی کا خارجہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔ میں یہ بات خانۂ خدا میں منبر رسول سے پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ اگر اس میں ذرہ برابر جھوٹ کا شائبہ ہو تو آپ حضرات کل قیامت میں میرا دامن تھام سکتے ہیں۔

علامہ کے اس خطاب نے جنگ کا نقشہ پلٹ دیا۔ عزیز المساجد میں موجود طلبہ کے چہروں پر اطمینان و مسرت کی لکیریں صاف ہویدا تھیں۔ سب خوش اور مطمئن ہو چکے تھے۔ لیکن جونہی نماز ختم ہوئی اور ہم لوگ واپس ہاسٹل پہنچے، اسٹرائک کے لیڈروں نے تقریریں شروع کر دیں: ''تم نہیں جانتے! علامہ بہت بڑے منطقی ہیں۔ علامہ نے اپنی منطق سے ہم لوگوں کو بے وقوف بنایا ہے۔ ہمارا احتجاج جاری رہے گا۔''

اچانک ان میں سے ایک لیڈر، اُن لیڈروں کے خلاف ہوگیا۔ یہ ہمارے شفیع الزماں بھائی تھے۔ انہوں نے کہا کہ علامہ نے برسر منبر اتنی ذمہ داری سے بات کی اور تم لوگ اس میں بھی منطق نکال کر اس میں کیڑے نکال رہے ہو۔ ہمیں علامہ کی بات مان لینی چاہیے اور احتجاج ختم کر دینا چاہیے۔ یہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے ہی تھے کہ طلبہ ان کو مارنے کے لیے ٹوٹ پڑے، لیکن زعمائے احتجاج نے بروقت ان کی حفاظت کی۔

اسٹرائک کے لیڈروں کی ایک خوبی کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی کہ انہوں نے ان دنوں ادارے کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچایا، نہ کسی کے خلاف سب وشتم اور بدتمیزی کی، حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے بے نمازی، ان دنوں خود بھی نمازی ہو گئے تھے اور دوسرے طلبہ کو بھی فجر میں جگا جگا کر مسجد لے جاتے تھے۔

علامہ ضیاء المصطفیٰ کے خطاب جمعہ کے بعد طلبہ کا ایک چھوٹا سا ٹولہ جامعہ کے حق میں ہوگیا تھا۔ راقم السطور بھی اسی میں شامل تھا۔ اساتذہ کی کوششوں سے اس قسم کے طلبہ کو باہم مربوط کیا گیا۔ جدید ہاسٹل/ برکاتی ہاسٹل میں ان کی میٹنگ ہوئی اور یہ طے پایا کہ جس طرح باغی طلبہ

عزیزی ہاسٹل کے سامنے والے پارک میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہمیں سینٹرل بلڈنگ کے سامنے والے پارک میں جمع ہونا چاہیے، جو عزیزی ہاسٹل کے پارک کے متوازی ہے۔ ۷۰، ۸۰ نفری قافلہ رات کے دس گیارہ بجے برکاتی ہاسٹل سے سینٹرل بلڈنگ کی طرف روانہ ہوا۔ بیچ میں عزیزی ہاسٹل کے سامنے باغی طلبہ کی دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں۔ ہم لوگوں کو ادھر سے آتا دیکھ کر بہت سے طلبہ ہم لوگوں کی خدمت کے لیے دوڑے۔ قریب تھا کہ طلبہ کے دونوں گروپ باہم دست و گریباں ہو جاتے اور معاملہ غلط رخ اختیار کر جاتا، تبھی اسٹرائک کے لیڈروں نے اپنے ساتھیوں کو اس عمل سے سختی سے روکا اور ایک بڑا سانحہ ہوتے ہوتے ٹل گیا۔ اگر لیڈروں نے بروقت مداخلت نہ کی ہوتی تو اس شب ہمارا کچومر نکلنا طے تھا۔ ہم لوگ سینٹرل بلڈنگ کے سامنے والے پارک میں جمع ہوئے اور ہمارے مقررین نے جامعہ کے حق میں تقریریں شروع کر دیں۔ مخالف خیمے سے بھی بعض طلبہ ہمارے خیمے میں آ گئے۔ اس دوران جامعہ کے ذمہ داران نے صورت حال کو قابو میں رکھنے کے لیے پولس انتظامیہ کو بلا لیا اور یہ اعلان کر دیا کہ جو طلبہ ادارے کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہیں، کل دس بجے تک ہر قیمت پر ہاسٹل خالی کر دیں۔

یہ رات بڑی کشمکش کی رات تھی۔ باغی طلبہ نے بڑی کوشش کی کہ دوسرے دن تمام طلبہ ہاسٹل خالی کر کے اپنے گھر چلے جائیں۔ دوسرے دن صبح سے ہی طلبہ کا قافلہ نکلنے لگا تھا اور دس گیارہ بجتے بجتے چودہ سو میں کل تین چار سو طلبہ ہی رہ گئے۔ اگلے دن سے تعلیم حسب سابق شروع ہو گئی۔ ادارے کے ذمہ داران نے گھر جانے والے طلبہ کے گارجین کو فوری طور پر خط لکھا کہ اگر وہ اپنے بچے کو لے کر ادارے میں حاضر ہوتے ہیں اور اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ ان کا بچہ جامعہ کے اصولوں کی پاس داری کرے گا تو اس کے داخلے کی تجدید کی جا سکتی ہے۔ اس حکمت عملی کے سبب بہت سے طلبہ مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر واپس آ گئے۔ کچھ وہ بھی تھے جو دوسرے سال آئے اور کچھ وہ بھی تھے جنہوں نے ہمیشہ کے لیے اپنا رشتہ اشرفیہ سے کاٹ لیا۔ بعض وہ بھی تھے جو اشرفیہ میں مولویت کے طالب علم تھے، انہوں نے ملک کے بعض معروف بریلوی اداروں میں پہنچ کر فضیلت کی دستار لے لی اور پورے مولانا بن گئے اور بہت سوں نے تو یہ سنگین فیصلہ لے لیا کہ اگر اشرفیہ نہیں تو پھر کہیں نہیں۔ افسوس ان کی تعلیمی زندگی اسی موڑ پر دم توڑ گئی۔

المختصر ۱۹۹۹ء کا اسٹرائک کا سانحہ تاریخی بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس میں جہاں ایک طرف ہمیں انتظامیہ کی اصول پسندی اور حکمت عملی نظر آتی ہے، وہیں طلبہ کی شرارت کے ساتھ ان کی حیرت انگیز ذہانت و فطانت اور خطابت و قیادت کا جوہر بھی کھل کر سامنے آتا ہے۔ دراصل اشرفیہ کے ذمہ داران کی اصول پسندی اور حسن انتظامی اور طلبہ کی ذہانت اور خود اعتمادی ایسے جواہر ہیں، جو ہمیں بہت زیادہ متأثر کرتے ہیں، جن کی قدرے تفصیل آئندہ سطور میں آیا چاہتی ہے۔

چوتھا منظر

نظام عمل

جمہوری ریاست کی کامیابی؛ مقننہ، عدلیہ اور منتظمہ کی آزادی وخودمختاری کے ساتھ باہمی حسن تعلق پر منحصر ہے۔

اس تناظر میں دیکھیے تو اشرفیہ بھی اپنے ذیلی اداروں کے ساتھ کامیاب جمہوریت کا عکاس ہے۔ مجلس شوریٰ، بنیادی پالیسی سازی کے ساتھ دیگر خارجی امور سے سروکار رکھتی ہے، جب کہ انتظامیہ داخلی سطح پر تعمیر واصلاح اور نظم وضبط سے متعلق جملہ فرائض کی انجام دہی کرتی ہے۔ اشرفیہ کی خوش قسمتی ہے کہ حافظ ملت کے بعد عزیز ملت مولانا شاہ عبدالحفیظ کی شکل میں اسے ایک مخلص سرپرست مل گیا، جن کے زیر سایہ مجلس انتظامیہ اپنے کاموں میں فعال وسرگرم ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں حاجی سرفراز مبارک پوری کی شکل میں متواضع، مخلص، سرفروش اور حسِ جمالیات سے بہرہ ور ایک ناظم اعلیٰ مل گیا جس نے تعمیر و تزئین کے حوالے سے جامعہ کو غیر معمولی ترقی دی۔ اشرفیہ ہر نو وارد کو پہلے اپنی جمالیات کی سحر میں گرفتار کرتا ہے، جس کا کریڈٹ حاجی سرفراز کو جاتا ہے۔

اشرفیہ کا پرنسپل جملہ تعلیمی امور میں خودمختار بلکہ بے تاج بادشاہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ سربراہ اعلیٰ بھی اس کے دائرۂ اختیارات میں مداخلت سے گریزاں رہتے ہیں۔ بیسیوں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں اس منصب کے فرائض حضرت علامہ محمد احمد مصباحی کے سپرد ہوئے، جنھوں نے اپنی حکمت وبصیرت سے عہد زوال میں دینی تعلیم کو انتہائی منظم، مفید اور کامیاب بنا دیا۔ روز اول سے اشرفیہ کا سب سے بڑا امتیاز اس کی درس

گاہیں ہیں جن کو حضرت مصباحی صاحب نے نہ صرف ترقی پذیر رکھا بلکہ ان کے اندر بعض سخت فیصلے لے کر بڑی مفید اصلاحات فرمائیں۔

اشرفیہ کا ایک دوسرا ذیلی ادارہ جو بہت ہی اہم ہے، وہ وہاں کا دارالافتا ہے۔ دارالافتا بھی ہمیشہ صدر مفتی کے کنٹرول میں رہا۔ ۲۰۰۰ء میں حضرت مفتی شریف الحق امجدی -رحمۃ اللہ علیہ- اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے بعد حضرت مفتی نظام الدین رضوی برکاتی صاحب نے اس منصب کو سنبھالا اور اپنی علمی تحقیقات، توازن و وسطیت اور تحمل و متانت سے دارالافتا کے وقار کو بلند ہی کیا، کم ہونے نہیں دیا۔

یہ تھی جامعہ اشرفیہ کے نظم وادارت کی اجمالی تصویر، اب قدرے تفصیل:

جامعہ اشرفیہ کی تنظیمی بساط پر سب سے نمایاں نام سربراہ اعلیٰ مولانا شاہ عبدالحفیظ دام ظلہ کا ہے، جنہوں نے دینیات کی تحصیل اشرفیہ سے ہی فرمائی ہے جب کہ علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی سے بی۔ایس۔سی۔کیا۔ میں انہیں حافظ ملت کے اخلاص اور شرافت کا عکس جمیل مانتا ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں ان کی سادگی اور خاموشی کو بس تکا کرتا تھا، قریب جانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوسکتا تھا، جس کی وجہ ہمارے سب مصباحی بھائی جانتے ہیں۔ اتنے بڑے ادارے کا سب سے بڑا منصب دار مبارک پور سے اشرفیہ اور اشرفیہ سے مبارک پور کبھی پیدل اور کبھی عام رکشہ سے آتا جاتا ہو، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ بعض مجہول راویوں کی روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ اس زمانے میں کسی نے حضرت کو Four Wheeler نذر کی تو اسے بھی آپ نے جامعہ کو نذر کر دیا۔

سربراہ اعلیٰ صاحب کی قدر میرے دل میں اس وجہ سے بھی تھی کہ انہوں نے پرنسپل کی سیٹ پر حضرت مصباحی صاحب جیسے مدبر و منتظم کو خود مختار بنا کر بٹھا دیا تھا، اس لیے بالواسطہ طور پر اشرفیہ کے تعلیمی نظم وضبط کا کریڈٹ بھی سربراہ اعلی صاحب کو ہی جاتا ہے۔ حضرت سربراہ اعلیٰ صاحب کا شمار ہندوستان کے کامیاب پیروں میں نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود جہاں تک میں جانتا ہوں، اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اپنے عام سے عام محبین و مریدین کی دعوت بھی قبول فرماتے ہیں اور محض اشرفیہ کی محبت اور ان کی دل داری میں ایسے علاقوں میں بھی پہنچتے ہیں اور ایسی جگہوں پر بھی بیٹھتے ہیں، جنہیں ہم جیسے بے وقعت لوگ بھی

خلاف شان سمجھیں۔ میں اپنی دانست کی حد تک یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی زندگی اشرفیہ کی تعمیر و ترقی کے گرد طواف کرتی بسر ہو رہی ہے۔

اشرفیہ آنے سے قبل میرے ذہن و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی کہ کسی دینی ادارہ کی چہار دیواری اس قدر طویل و عریض ہو سکتی ہے۔ پھر اس میں اتنی بڑی بڑی عمارتیں ہوں گی، جن کی تزئین و زیبائش پر اس قدر صرفہ کیا گیا ہوگا۔ ان کے سامنے پارک ہوں گے جن کو پھولوں اور سبزوں سے آراستہ کیا گیا ہوگا۔ بڑی بڑی قینچیوں سے پھولوں اور پودوں کو تراشا جاتا ہوگا اور برقی مشین کے ذریعے سبزوں کو مسطح کیا جاتا ہوگا اور ان سب کاموں کے لیے الگ سے مستقل عملہ ہوگا۔ اشرفیہ پہنچ کر سب سے پہلے میں اسی سے متاثر ہوا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ سب کچھ حاجی سرفراز کے دم قدم سے ہے۔

چھوٹا قد، نسبتاً گٹھا بدن، کلین شیو کتابی چہرہ، ۳۵/۴۰ سال کا ایک جوان سینٹرل بلڈنگ کے سامنے سبز پارکوں میں کھڑے باغبانوں کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی نے بتایا کہ یہ ناظم صاحب ہیں۔ میں نے کہا: یہ ناظم صاحب ہیں؟ اتنے بڑے ادارے کا ایسا عام سا ناظم؟ اس وقت میرا ایک شرعی استدلال یہ بھی تھا کہ اتنے بڑے دینی ادارے کا ناظم بغیر داڑھی کا کیوں کر ہو سکتا ہے؟

استاذ گرامی مولانا جلال الدین (۱) صاحب رابعہ کے سال ایک دن درس قرآن کے دوران کہنے لگے:

''یار! میں تو منھ پھٹ آدمی ہوں۔ میں تو بول دیتا ہوں کہ حاجی صاحب! سارے پارکوں میں تو سبزہ آ گیا۔ آپ کے اس پارک [داڑھی] میں کب آئے گا؟ بے چارے ناظم صاحب شرمندہ ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حج کے بعد ان شاء اللہ۔ لیکن اب تو حج بھی کر آئے اور اسی لیے اب وہ مجھے دیکھ کر راستہ بدل لیتے ہیں۔''

---

(۱) مولانا مجھ پر بڑے شفیق تھے۔ اپنے خاص انداز سے ذیشان بھائی کہہ کر مخاطب کرتے۔ تصنع سے پاک، نڈر اور بے باک خطیب و مدرس تھے۔ ان کی بے باکی بسا اوقات تہذیب کی سرحدوں سے گزرتی محسوس ہوتی۔ الہ آباد کے اطراف میں انھوں نے خانقاہ عارفیہ کے خلاف بھی اس قسم کی ''حق گوئی و بے باکی'' کا مظاہرہ کیا۔ ان کے اس طرح کی بیان و انداز سے اہل اشرفیہ بھی پریشان تھے۔ بالآخر انہیں اشرفیہ کو خیر باد کہنا پڑا۔

خیر! یہ اس وقت کی بات ہے۔اب ناظم صاحب ہمارے پیمانوں پر بھی متشرّ ع ہو چکے ہیں اوراب تو ان کے سیاہ گلابوں کے چمن میں بہت سے بیلی اور چنبیلی کے سفید پھول بھی کھِل اٹھے ہیں۔ اشرفیہ کی اپنی ۶ ؍سالہ مدت قیام کے دوران میں نے جب بھی انہیں دیکھا سنجیدہ، مگر ہشاش بشاش پایا۔ گورے چہرے اور سرخ ہونٹوں پر ہر وقت مبارک پوری پان کی باریک لکیریں ان کی حس لطافت اور ذوق جمالیات کی چغلی کھاتی تھیں۔ اس پوری مدت میں، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی طالب علم کو ڈانٹ رہے ہوں یا کسی استاذ کے ساتھ سخت لہجے میں بات کر رہے ہوں ۔ میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت ایسا ناظم ہر دینی ادارے کو دے جو اپنے گھر سے زیادہ مدرسے کے در و دیوار کو چمکانے کی فکر کرتا ہے اور کعبۂ تعلیم سے فقر و نحوست کی میلی چادر اتار کر اس کی جگہ اس پر خوش نما ایرانی اور یمنی غلاف چڑھا کر اس کے ظاہر کو عصری جامعات کی طرح دلکش اور جاذب بنانا چاہتا ہے۔

خاکم بہ دہن! زمانۂ طالب علمی میں طلبہ جس قدر تبرا حضرت مصباحی صاحب پر پڑھتے ہیں وہ صرف انہیں کا حصہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہی طلبہ جب فارغ ہو کر عملی زندگی میں آتے ہیں اور کسی ادارے میں انہیں انتظامی امور سنبھالنے کا موقع ملتا ہے، اس وقت انہیں حضرت مصباحی صاحب کی سختیوں اور اصول پسندیوں کی قدر و قیمت سمجھ آتی ہے۔ میں بلا خوف لومۃِ لائم یہ کہہ سکتا ہوں کہ فراغت کے بعد فرزندان اشرفیہ ''مصباحی'' کا ٹائٹل لے کر ہی باہر نہیں آتے ،حضرت مصباحی صاحب کے اصولوں اور ضابطہ بندیوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ مصباحیوں کی تعلیمی لیاقت اشرفیہ کی درس گاہوں کی رہین منت ہے تو داخلی سطح پر ان کی تنظیمی صلاحیت حضرت مصباحی صاحب کی شخصیت سے منعکس ہے۔

مصباحی صاحب نے اشرفیہ کے داخلی اور تعلیمی نظم میں جو اصلاحات پیدا کی ہیں ان میں وقتاً فوقتاً نصاب کی تجدید، بنیادی نصابی کتابوں کی تصنیف و تالیف، طلبہ کو پورے سال بھر پڑھنے کے لیے ترغیب و تشویق، نمازوں کی پابندی اور ہاسٹل میں غیر ضروری شور و شغب کو روکنے اور طلبہ کی اخلاقی تربیت کے لیے وعظ و تذکیر، بہت اہم ہیں۔

اشرفیہ کے طلبہ کسی نو وارد کے آنے پر، بجلی کے جانے پر، کسی جونیر استاذ کے وعظ و بیان پر پہلے جس طرح کا ردعمل کرتے تھے اور جس قسم کی آوازیں نکالتے تھے، میرے

آخری ایام میں اس میں کافی کمی آ گئی تھی اور اب مزید کمی آئی ہوگی۔ ۲۰۰۰ء کے بعد حضرت مصباحی صاحب گاہے بہ گاہے طلبہ کو عزیز المساجد میں جمع کر کے اصلاحی اور اخلاقی امور کی طرف متوجہ کرتے۔ ایک بار کہنے لگے کہ مجھے رات کو ہاسٹل سے جس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، یقین ہی نہیں آتا کہ اس میں انسان بھی رہتے ہیں۔ یہ ہاسٹل کے بجائے چڑیا خانہ معلوم ہوتا ہے۔

مصباحی صاحب کے مواعظ بڑے اثر انگیز ہوتے اور کئی کئی دنوں تک نمازوں اور جماعتوں میں خاص طور پر ان کا اثر دکھتا۔ مصباحی صاحب کی گفتگو مختصر، مربوط اور مسلسل ہوتی۔ طلبہ کا خیال تھا کہ اگر ہر جملہ سے پہلے ''اور'' کی تکرار کو حذف کر دیا جائے تو ان کی تقریر ایک منظم تحریر بن جائے۔ ہمارے دوست مولانا صوفی غلام مدثر رضوی ازہری نے بارہا چاہا کہ حضرت مصباحی صاحب کے مواعظ کو ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے محفوظ کر لیں، لیکن کسی ٹیپ ریکارڈر کی کیا مجال جو حضرت مصباحی صاحب کی آواز کو اپنی قید میں لے سکے۔ ہم لوگوں نے کئی بار کوشش کی تھی اور ہر بار ناکام ہوئے تھے۔

اس وقت مصباحی صاحب کی جگہ حضرت مفتی نظام الدین صاحب ہیں۔ امید ہے کہ انہوں نے بھی مصباحی صاحب کی طرح ہی نظم وضبط کو قائم رکھا ہوگا۔(۱)

اب اشرفیہ کے ایک اہم ذیلی ادارے سے متعلق باتیں کر لیں، جو اس کے فکر و مسلک کا ترجمان بھی ہے اور برصغیر کے خوش عقیدہ مسلمانوں کی فکری واعتقادی اصلاح و تشکیل کا نمائندہ بھی۔ یعنی اشرفیہ کا دارالافتاء۔ اس کے حوالے سے یہ رائے تقریباً مسلم ہے کہ یہ ادارہ اپنی راہ پر انتہائی اعتدال وتوازن کے ساتھ گامزن ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے دوست مفتی رحمت علی مصباحی نے بتایا کہ حضرت مفتی صاحب قبلہ تربیت افتا کے طلبہ کو سختی کے ساتھ تاکید کرتے ہیں کہ شخصی تضلیل وتکفیر کے معاملے میں حتی الوسع اپنے قلم کو روک کر رکھیں۔ مجلس شرعی مبارک پور کو بھی ہم دارالافتا کا ہی ایک ذیلی ادارہ سمجھتے ہیں، جس

---

(۱) یہ بات ہم نے ۲۰۱۸ء میں لکھی ہے۔ اب مفتی نظام الدین صاحب کی مدت صدارت بھی اختتام پذیر ہوئی۔ ۲۰۲۱ء سے اس منصب پر مفتی بدر عالم مصباحی صاحب جلوہ افروز ہیں۔ یہ حضرات بھی اس منصب کی عظمت کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!

کے تحت حضرت مفتی صاحب نے عصر حاضر کے بہت سے حساس شرعی مسائل میں علمائے عصر کے ساتھ مل کر امت کی رہنمائی کے لیے متفقہ حل نکالنے کی کوشش کی ہے۔(۱)

❁❁❁❁

(۱) ہندوستان میں جدید فقہی مسائل پر اجتماعی غور وخوض کے لیے سب سے پہلے علامہ ارشد القادری کی کوششوں سے اشرفیہ مبارک پور میں ۱۹۸۵ء میں شرعی بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی، جس کی مختلف نشستوں میں رویت ہلال اور مائک پر نماز جیسے مسائل پر اجتماعی غور وخوض کیا گیا، لیکن یہ کوشش بہت نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکی۔ اس کے بعد بڑے پیمانے پر یہ کام مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے کیا اور ۱۹۸۹ء میں فقہ اکیڈمی دہلی کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں مختلف مکاتب فکر کے علما شریک ہوتے رہے۔ بریلوی حلقے کی نمائندگی مفتی نظام الدین رضوی اور مفتی آل مصطفیٰ مصباحی وغیرہ نے کی، لیکن بعد میں 'مسلکی تحفظات وتعاقبات' کے زیر اثر ان حضرات نے وہاں جانا چھوڑ دیا اور بالآخر بریلوی علما نے ۱۹ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو ''مجلس شرعی'' قائم کی، جو مسلکی سطح پر ہی سہی، کامیابی کے ساتھ اجتماعی تحقیق کی انجام دہی میں کافی حد تک کامیاب رہی، لیکن اسے زور کا جھٹکا اس وقت لگا جب ۲۰۰۳ء میں مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب نے اشرفیہ چھوڑا اور اسی سال مولانا اختر رضا خان ازہری کے ساتھ مل کر بریلی میں شرعی کونسل آف انڈیا قائم کردی، جس کے بعد بریلوی علما کی اجتماعی تحقیق دو حصوں میں منقسم گئی۔

اس قسم کی علمی کوششوں کی اہمیت اور فوائد سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن موجودہ حالات ومسائل ان حوالوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعیت کے متقاضی ہیں۔ کاش مولیٰ کریم اس کی کوئی سبیل پیدا فرمائے۔

پانچواں منظر

کلاس روم

آج چوتھا دن تھا۔ درس گاہ میں استاذ کے بازو میں حافظ ملت بھی موجود تھے۔ استاذ نے کلمۂ جلالت کی تحقیق پر اپنی تقریر شروع کی اور جونہی اپنی تقریر مکمل کر کے خاموش ہوئے، حسب سابق چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی۔ اپنے طلبہ کے ذوق علمی اور جرأت گفتار کو حافظ ملت دیکھتے جاتے اور مسکراتے جاتے۔ جب سب کے سوالات پورے ہو گئے، حافظ ملت نے لائبریری سے چند کتابیں منگوائیں اور باری باری ہر ایک کے سوال کا جواب کسی کتاب کو کھول کر اس سے دے دیا۔ طلبہ مطمئن ہو گئے، حافظ ملت بے انتہا خوش ہوئے اور طلبہ کو دعائیں دیں اور بیضاوی کا سبق جو پچھلے تین دنوں سے کلمۂ جلالت کی تحقیق پر رکا ہوا تھا، آگے بڑھ گیا۔ درس گاہ کے استاذ مولانا ضیاء المصطفیٰ تھے، جو ابھی بانکے جوان تھے اور اسی سال جامعہ میں ان کی بحالی ہوئی تھی۔ آتے ہی بیضاوی جیسی منتہی اور درس نظامیہ کی مغلق ترین کتابیں ان کے سپرد ہو گئی تھیں۔ لیکن اشرفیہ کے طلبہ اس کو کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ایک نوجوان عالم آتے ہی بیضاوی جیسی کتابیں ہمیں پڑھانے لگے۔ اس لیے طلبہ نے طے کر لیا کہ جو بھی ہو، کلمۂ جلالت کی تحقیق میں مولانا کو الجھا کے رکھنا ہے۔ اس کے لیے وہ اشرفی دار المطالعہ میں بیٹھ کر رات رات بھر مختلف کتب تفسیر کا مطالعہ کرتے اور اپنے شبہات نوٹ کر کے صبح درس گاہ آتے۔ درس گاہ میں جوں ہی مولانا اپنی تقریر پوری کرتے، ہر طرف سے اعتراضات اور جواب الجواب کا سلسلہ نکل پڑتا۔ تین دن تک جب یہ معرکہ سر نہ ہو سکا اور مولانا نے طلبہ کی شرارت و ذہانت کا اندازہ کر لیا تو مجبوراً انہیں حافظ ملت سے شکایت کرنی پڑی۔

یہ روایت ہمارے گاؤں کے پہلے مصباحی عالم مولانا خلیل الرحمن کی ہے، جن کو میرے والد نے اپنے سلسلۂ تعلیم کے انقطاع کے بعد اشرفیہ بھیجا تھا۔ بقول ان کے اس درس میں وہ خود بھی شریک تھے۔ اس واقعے کی روشنی میں اشرفیہ کی درس گاہی روایت کی عظمت، اساتذہ کی علمی مہارت، صبر واستقامت اور محبت وشفقت کے ساتھ طلبہ کی ذہانت، آزادی فکر، جرأت سوال، خود اعتمادی اور شرارت کی ایک ہلکی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

اشرفیہ میں ہمیشہ قابل اساتذہ کا انتخاب ہوتا رہا ہے۔ درس گاہوں میں خیرآبادی منہج تدریس کے مطابق کوئی طالب علم پہلے عبارت پڑھتا ہے، استاذ پورے درس پر ایک جامع تقریر کرتا ہے، جس میں درس کے خلاصے کے ساتھ عبارت کتاب کے مبہمات و مغلقات کی عقدہ کشائی ہوتی ہے۔ بعدازاں طلبہ کو عام اجازت ہوتی ہے کہ جو سوال چاہیں استاذ سے بے جھجک کرلیں۔ طلبہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے شبہات رکھتے ہیں، خاص طور پر اگر کوئی نیا استاذ آگیا تو پھر ان کی رگ شرارت پھڑک اٹھتی ہے اور درس گاہ اچھی خاصی رزم گاہ کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

ہم اپنے زمانۂ طالب علمی کی بات کریں تو اشرفیہ میں پہلے طلبہ بہت ہی مسٹنڈے اور عمر دراز رہا کرتے تھے، اساتذہ میں کوئی نوخیز ہو، اس کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ ہمارے سامنے سب سے بزرگ شخصیت حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جنہوں نے سالوں پہلے سے درس وتدریس سے کنارہ کش ہوکر تصنیف وافتا کے لیے خود کو وقف کردیا تھا۔ اس لیے ان سے شرف تلمذ کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوسکتا تھا۔ البتہ ان کی شدید ڈانٹ کھانے کا شرف ضرور حاصل ہے۔ پہلے سال ہی حضرت مولانا اعجاز احمد مبارک پوری مرحوم کی پہلی گھنٹی تھی۔ ایک دن میں پانچ منٹ تاخیر کے ساتھ بھاگا چلا جارہا تھا۔ جوں ہی دارالافتا کے سامنے سے گزرا، ایک کرخت آواز نے مجھے پیچھے سے آلیا۔ میں حضرت مفتی صاحب کے پاس پہنچا۔ حضرت نے صرف نام اور صوبہ معلوم کیا، اس کے بعد وجہ تاخیر معلوم کرنے کی حاجت ہی نہ رہی۔ پھر اس کے بعد حضرت نے جو کچھ مجھے سنایا، یکبارگی ساتوں طبق روشن ہوگئے۔ اس کے بعد کبھی بھی تاخیر سے سامنے سے نہیں گزرا اور وقت پر گزرتے ہوئے بھی اس سانحۂ رفتہ کی یاد ضرور آئی۔

خیر! اس قسم کے جزوی سانحات سے قطع نظر مفتی صاحب اشرفیہ کے لیے بہت مخلص تھے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود کو اس کے لیے پورے طور سے وقف کر دیا تھا۔ وہ اشرفیہ اور مصباحیوں پر ہمیشہ فخر کرتے تھے اور اکثر و بیشتر ترانۂ علی گڑھ کے ایک مصرع کو قدرے ترمیم کے ساتھ ایک شعر بنا کر اشرفیہ اور فرزندان اشرفیہ کی شان میں بصد شوق و افتخار پڑھا کرتے تھے:

جو ابر یہاں سے اٹھا ہے وہ سارے جہاں پر برسا ہے
جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا

حضرت مفتی صاحب کے بعد دوسری سب سے بڑی شخصیت علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری کی تھی۔ حضرت علامہ کا علمی جاہ و جلال تو اپنی جگہ مسلم، ان کا سینس آف ڈریسنگ اور سینس آف ہیومر بھی ایسا ہے، جو اپنے اندر سحر انگیز کشش رکھتا ہے۔ بولنے اور چلنے کا خاص آہنگ اس پر مستزاد۔ ان کی تدریس خصوصاً درس بخاری کا بڑا شہرہ تھا۔ میری بڑی آرزو تھی کہ ایسے عالم ربانی سے شرف تلمذ حاصل کروں، لیکن خدا کا کرنا دیکھیے کہ علامہ خامسہ میں ترمذی پڑھاتے تھے، میں جب خامسہ میں پہنچا، اس سال سے انہوں نے ترمذی کا درس چھوڑ دیا، سادسہ میں شرح ہدایۃ الحکمت پڑھاتے تھے، سادسہ میں پہنچا تو انہوں نے شرح ہدایۃ الحکمت کو بھی چھوڑ دیا۔ بڑی تکلیف ہوئی۔ سوچا کہ اب اگلے سال صحیح مسلم کا درس لوں گا، لیکن جوں ہی سابعہ میں پہنچا، انہوں نے درس مسلم بھی چھوڑ دیا۔ اب ایک سال بچا تھا فضیلت کا اور ایک کتاب ان کے زیر درس رہ گئی تھی، صحیح بخاری، لیکن فضیلت میں پہنچنے سے قبل سابعہ کے سال ہی عرس حافظ ملت کے موقع پر انہوں نے اشرفیہ ہی چھوڑ دیا، جس کا ظاہری سبب مولانا عبید اللہ خاں اعظمی کا خطاب تھا۔ رہے باطنی اسباب تو وہ ارباب باطن جانیں۔

مولانا اعظمی نے جو کچھ کیا وہ صحیح تھا یا غلط؟ اس پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں! خطاب بحیثیت خطاب کی داد نہ دینا شاید ادبی اور لسانی حق تلفی ہوگی۔

''ایک بنگلہ دیشی گروپ اس وقت سامنے آیا تھا، جب حافظ ملت الجامعۃ الاشرفیہ کی تشکیل کر رہے تھے اور دوسرا بنگلہ دیشی گروپ آج اشرفیہ کے عہد عروج میں ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے سب کی دم اٹھا کر دیکھ لی ہے، کوئی نر نہیں سب مادہ ہیں''۔

یہ اور اس قسم کے کاٹ دار جملوں کے ساتھ، شیر کی دہاڑ، چیتے کی رفتار، لفظوں کی بازی گری اور جملوں کی گولہ باری کرتے ہوئے، بے خوف و بے خطر، بے توقف بے جھجھک، بغیر اٹکے، بغیر کسی جملے کو ادھورا چھوڑے، نان اسٹاپ بولتے چلے گئے۔ جوش و غضب کی شدت میں مخاطب کی پگڑی سلامت رہی یا نہیں، اردوئے معلیٰ کے آداب پوری گفتگو میں ملحوظ رہے۔ تھوڑی دیر کے لیے جامعہ اشرفیہ کا پورا گراؤنڈ سراپا سماعت بن چکا تھا۔ جیسے ہوائیں رک گئی ہوں اور زمانے ٹھہر گئے ہوں۔ جو جہاں تھا ساکت و جامد اعظمی صاحب کے لفظوں پر کان لگائے کھڑا تھا۔ کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟

بہر کیف! میں علامہ کے شرف تلمذ سے محروم رہا، جس کا فراغت کے بعد بھی بہت دنوں تک قلق رہا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ قلق رفتہ رفتہ مسرت میں تبدیل ہو گیا۔

جن اساتذہ سے راقم کو شرف تلمذ حاصل ہے، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ذی علم و جفاکش اور میرے حق میں انتہائی شفیق تھا۔ اس کے باوجود ۶ رسالہ مدت قیام میں کسی بھی استاذ کے ساتھ میرا خصوصی یا گہرا تعلق نہیں رہا۔ جن کی محبتیں سب سے زیادہ پائیں، اگر میں خطا نہیں کر رہا ہوں تو وہ حضرت مولانا اختر کمال ہیں۔ ان کے لفظ ''ابے بانز'' میں جو پیار تھا وہ کچھ ان کے خاص تلامذہ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کی ناراضگی بھی طلبہ کو ایک خاص قسم کا لطف دے جاتی ہے۔ انہیں دائمی نزلہ تھا، جس کی وجہ سے انہیں خوش بو سے الرجی تھی۔ بہت مزہ آتا اگر کوئی ان کی درس گاہ میں خوش بو لگا کر آجاتا۔ زیر لب تبسم کے ساتھ فرماتے: ''ابے بانز! بدبو لگا کر کون آ گیا'' اور ہم لوگوں کو مزہ آجاتا۔ ان کی زبان میں بہت معمولی سی لکنت ہے، جو ان کے بیان کو مزید مزیدار بنا دیتی ہے۔ معلم الانشاء میں یُعَبِّرُ البَحرَ الأَطلَنطِی کا لطف آپ کو لینا ہے تو مولانا عارف اقبال سے رابطہ کر لیں۔ بہر کیف! حضرت مولانا مجھ پر بہت شفیق تھے۔ ''شاہین'' کے نام سے میں جو اردو وال میگزین نکالا کرتا تھا، اکثر و بیشتر اس کی اصلاح وہی فرمایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا صدر الوریٰ صاحب کی علمی درس گاہ کی یادیں بھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ ان کی آواز کی بلندی اور صفائی اور کسی قدر کرخنگی اور تقریر درس کی جامعیت

بےنظیر تھی۔ مولانا بہت سنجیدہ ہیں۔ سیاست حاضرہ سے بے نیاز، اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ لیکن زاہد خشک بھی نہیں۔ پر لطف باتوں سے لطف بھی لیتے ہیں اور دوسروں کی طرح منہ پھاڑے بغیر اندر ہی اندر ہل ہل کر ہنستے بھی جاتے ہیں۔ اب قطبی مع المیر کے ایک درس کی روداد سنیے:

چوتھی لائن میں ایک طالب علم عبارت پڑھنے کے خوف سے سر جھکائے یا یوں کہیں کہ تپائی میں سر گھسائے بیٹھا تھا۔ حضرت مولانا نے عبارت پڑھنے کی ذمہ داری اسی سر پر ڈال دی۔ یہ جناب سرفراز تھے۔ اب ہڑبڑاہٹ میں میاں سرفراز نے جو عبارت پڑھنی شروع کی تو عِندَ الفَارَابی کو عِندَ الفَارِ أَبی کر دیا۔ حضرت مولانا دیر تک اس پر ہنستے رہے۔ کوشش کے باوجود بھی ان کی ہنسی تھی کہ رکتی ہی نہ تھی۔ کہا: ترجمہ کرو!

''اس چوہے کے پاس جو میرا باپ ہے''

یہ ترجمہ کیا اور پھر دیر تک ہنستے رہے۔

مولانا صدرالوریٰ صاحب کی درس گاہ میں سوال و جواب کا سلسلہ بھی خوب چلتا اور مولانا بڑے اطمینان اور سنجیدگی سے طلبہ کے سوالات کا جواب دیتے۔ میرا ایک سوال انہیں بہت پسند آیا تھا، جس کا ذکر میرے غائبانے میں انہوں نے دوسروں سے بھی کیا۔ شرح وقایہ کے درس میں رضاعت کے باب میں، میں نے سوال کیا کہ مدت رضاعت میں بچہ دودھ پی لے تو حرمت رضاعت ثابت ہوجاتی ہے، جس کی علت جزئیت بتائی جاتی ہے، لیکن یہ علت تو مدت رضاعت کے بعد بھی پائی جاتی ہے، پھر حرمت رضاعت کیوں نہیں ثابت ہوتی؟ مولانا تھوڑی دیر کے لیے بالکل خاموش ہو گئے۔ یہ سوال ان کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ لیکن چند ثانیے کے تفکر کے بعد اس کا فاضلانہ جواب عنایت فرمایا، جو برمحل اور دل کو چھو لینے والا تھا۔

''یہ مسئلہ بنیادی اعتبار سے عقلی نہیں ہے، تاہم عقلی طور پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جزئیت کا تعلق تو بڑوں میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن یہ تعلق بہت نحیف ہوتا ہے، کیوں کہ دودھ بچے کی واحد غذا ہوتا ہے، جب کہ بڑوں کی غذا دودھ نہیں ہوتا، بلکہ دودھ ان کی غذا کا بہت معمولی جز ہوتا ہے۔''

میں یہ بات جانتا ہوں کہ اردو- وہ بھی تھوڑی بہت- کے علاوہ مجھے کوئی زبان نہیں آتی۔ عربی کی تھوڑی بہت جو شد بد ہے، وہ حضرت مولانا نفیس احمد مصباحی کی درس گاہ فیض کا نتیجہ ہے۔ خصوصاً عربی انشا کا مجھے جو کچھ شعور ہے، اسی درس گاہ کا حاصل ہے، جس کا اثر کچھ نہ کچھ اردو میں بھی محسوس کرتا ہوں۔ اشرفیہ سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ سے میں نے عربی سے گریجویشن کیا، وہاں پر crisis کے معنی أزمة اور region کے معنی منطقة تو سیکھ لیے، لیکن قوت انشا میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس لیے میں مولانا کا دل سے ممنون رہتا ہوں۔ اس پر مستزاد ان کی نفاست ہے، جو ان کے نام سے ماخوذ ہے۔ سنجیدگی، شائستگی، علم دوستی، طلبہ نوازی اور لایعنی امور سے کلیۃً احتراز بھی ان کی مومنانہ شخصیت کے خاص عناصر ہیں۔

''تقریر الٹی ہوگئی۔'' مجھے پہلے مولانا عبدالحق صاحب کا ذکر کرنا تھا۔ قارئین! اسے اپنے طور پر سیٹ کرلیں۔ یہ دل پذیر فقرہ بھی حضرت والا ہی کا ہے۔ بارہا درس گاہ میں اس کے اعادے کی نوبت آجاتی اور بعض دفعہ تو یہ بھی ہوتا کہ تقریر کے پلٹ جانے کا علم ہوجانے کے بعد بھی پہلے وہ اپنی تقریر مکمل فرماتے، پھر بعد میں کہتے چلو اب اسے تم لوگ پلٹ لو۔ ایک بار درس ہدایہ کے دوران بھی ایسا ہی ہوا۔ جب صابر رضا پورنوی نے کہا کہ حضور! تقریر الٹ گئی۔ یہ دلیل امام صاحب کی نہیں بلکہ امام ابو یوسف کی ہے۔ تو حضرت مولانا نے فرمایا:

''ابے ابھی سن''

پھر اپنی گفتگو مکمل کرنے کے بعد فرمایا:

''عزیزم! اب اسے پلٹ لے۔''

حضرت مولانا عبدالحق صاحب اگر درس گاہ میں کوئی اچھا لفظ بول دیں تو اس کی تکرار لازمی ہوجاتی ہے۔ ''جی سلمہ! بول، میں کیا بولا؟ بول بول''۔ پھر جب تک ہر چہار گوشے سے اس کی بازگشت نہ آجاتی، بات آگے نہیں بڑھتی۔ ایک دن کسی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے ''مرنجاں مرنج'' کا لفظ زبان پر آگیا۔ چہرہ کھل اٹھا، آنکھیں چمکنے لگیں۔

''بول بول سلمہ، کیا بولا؟''

اب چاروں طرف سے ''مرنجاں مرنج'' کی صدائے بازگشت آنے لگی۔ دل نے

کہا: ''نہیں معلوم، واضع نے اس لفظ کی وضع کس کے لیے کی تھی، لیکن یہ لفظ حضرت مولانا کی قبائے دل پذیر پر ضرور پورے طور پر چسپاں ہوتا ہے، خصوصاً جب درس گاہ میں ہوں اور موڈ میں ہوں۔''

مولانا عبدالحق صاحب نے ہمیں شرح ہدایۃ الحکمت پڑھائی۔ سچ پوچھیے تو مجھے بڑا لطف آتا۔ جب درس کی تیاری کے ساتھ آتے تو ایک ایک لفظ کی ایسی وضاحت کرتے اور ایک ایک شبہے کا ایسا ازالہ کرتے، جیسے ابھی ابھی براہ راست مصنف کتاب سے پڑھ کے آرہے ہوں۔ لیکن کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ درس گاہ میں ہی عبارت خوانی کے دوران مطالعہ کرتے اور پھر پڑھانا شروع کر دیتے، جس سے کبھی کبھار تقریر الٹی بھی ہو جاتی۔ مولانا بڑے ذہین، حاضر جواب، نڈر اور باذوق واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے سامنے کی میز پر کبھی کسی ایسے طالب علم کو بیٹھنے نہ دیتے جس کے چہرے سے غباوت کا ظہور ہوتا ہو۔ اگر کوئی غبی طالب علم سامنے بیٹھ گیا، مولانا نے اپنی پر جوش تقریر ختم کرنے کے بعد داد طلب نگاہوں سے اسے دیکھا، اور اندازہ ہوا کہ تقریر، صاحب کے سر سے گزر گئی، تو فوراً ارشاد فرماتے:

''چل چل چل، چل سلمہ تو پیچھے چل۔''

ایسے ہی اگر سامنے کوئی چشمے والا بیٹھ جاتا تو اس کو مخاطب کر کے فرماتے: بول بے، بول چشم الدین کیا بولا؟ اسے کلاس کے آخر تک یہی سننا پڑتا۔ کبھی تو یہ گمان گزرنے لگتا کہ شاید اس کا نام ''چشم الدین'' ہی ہو۔ مولانا فاروق ماہمی کے بقول ایسا واقعہ خود ان کے ساتھ بھی وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

شرح ہدایۃ الحکمہ کا جب آخری درس دیا تو فرمایا:

''سلمہ! یہ وہ ننگی کتاب ہے جس میں نہ کوئی حاشیہ ہے اور نہ ہی بین السطور۔ میں نے تقریباً بیس سالوں بعد، اس کتاب کو پڑھایا۔ خود بھی بے وقوف بنا اور تم لوگوں کو بھی بے وقوف بنایا۔ کیا بولا؟۔۔۔ اب یہ سب کتابیں پڑھانے کے لائق نہیں ہیں، یہ سب میوزیم میں رکھنے کے لائق ہیں۔ کس کے لائق ہیں؟۔۔۔ میوزیم میں رکھنے کے لائق ہیں۔ اب تم لوگ پرنسپل صاحب کے پاس جاؤ اور اس کتاب کو میوزیم میں ڈلوا دو۔''

مدارس اسلامیہ میں فلسفے کی تعلیم کے حوالے سے اپنے خیالات (۱) میں کسی اور موقع پر رکھوں گا، سردست قارئین کو بتادوں کہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب کے الطاف کریمانہ کا میں بھی خاص سزاوار رہا ہوں۔ البتہ گذشتہ دنوں ایک مسئلے پر ٹیلی فونک گفتگو کے دوران وہ کچھ ناراض سے ہوگئے۔ انہوں نے کئی بار ''تو تو'' کہا تو میں نے بھی ایک بار ''میں'' کہہ دیا، جس پر یقیناً وہ ناراض ہوں گے۔ لیکن یہ بات کون نہیں جانتا کہ بچے جب بڑے ہوجاتے ہیں تو کچھ اپنا دماغ بھی چلانا شروع کردیتے ہیں اور کبھی کچھ بدتمیزی بھی کرجاتے ہیں، جس کی وجہ سے بسا اوقات والدین ان پر ناراض بھی ہوجاتے ہیں۔ لیکن والدین کی ناراضگی آخر کب تک؟ وہ تو سَبَقَت رَحمَتی غَضَبِی کے مظہر ہوتے ہیں۔

❁❁❁❁

(۱) یہاں اجمالی طور پر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستانی مدارس میں فلسفے کی تعلیم ضروری ہے۔ حقائق فلسفہ کے ساتھ تاریخ فلسفہ سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی جدید فلسفے سے آشنائی اور ان دونوں کے تقابل وتناظر سے آشنائی بھی لازم ہے۔ ان امور سے ناآشنائی کے سبب مدارس میں حرفیت پسندی اور نئے حالات ومسائل کے فہم سے دوری بڑھتی جارہی ہے، جو تشویش ناک ہے۔

کلاس روم-۲

جی کہاں تھے؟ بال چیک کیوں نہیں کروائے؟ استاذ گرامی نے کسی قدر نون غنہ کے ساتھ استفسار فرمایا۔

حضور! میں تین بار آیا تھا۔ آپ تھے ہی نہیں۔

اچھا! میں ہی نہیں تھا۔ سب کے لیے تھا۔ آپ ہی کے لیے نہیں تھا۔

حضور! میں اکیلا کہاں ہوں۔ میرے ساتھ اتنے سارے طلبہ ہیں۔

اچھا! ابھی بتاتا ہوں! کیوں غلام نبی! تم کہاں تھے؟

حضور! ہم بھی آئے تھے۔

تم بتاؤ جی، تم بھی کہو گے کہ ہم بھی آئے تھے۔

یکے بعد دیگرے سب سے یہی سوال و جواب ہوتا رہا۔ پھر حضرت نے بڑے اطمینان کے ساتھ پیچھے کی طرف ہاتھ بڑھایا، اپنی مسند ہٹائی، بستر کے نیچے ہاتھ لگایا اور تقریباً ڈھائی انچ موٹی اور ڈھائی فٹ لمبی تنبیہ الغافلین نکالی۔ میں دیکھ رہا تھا۔ میری تین انگلیوں کے برابر حضرت کی ایک انگلی تھی اور میرے دونوں پنجے ملا کر ان سے ذرا ضخیم ان کا ایک پنجہ تھا۔ عصا کو پوری مضبوطی کے ساتھ اپنے پنجے میں لیا۔

چلو دایاں ہاتھ بڑھاؤ۔ مجھے امید تھی کہ میری عمر و صحت نہیں تو کم از کم یہی کہ میں جماعت میں ایک نمبر پر ہوں، اس کی رعایت ہوگی۔ لیکن یہ کیا؟ جس انداز سے انہوں نے عصا اچھالا اور پوری طاقت کے ساتھ رسید کیا، منہ سے سسکاری اور کانوں سے دھواں نکلنے

لگا۔اپنے گاؤں کے رشید بھائی یاد آ گئے جو صبح صبح اسی شان سے اپنی بھینس کی خدمت کرتے ہیں۔ایسا لگا کہ میرے ہاتھ کی نازک ہڈیاں اپنی جگہ سے ہل سی گئی ہوں۔غصے نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو خشک کر دیا۔سوچا کہ لوہار کی یہ ایک ہی سنار کی سو کو کافی ہوگی اور اب مجھے چھٹی مل جائے گی۔لیکن یہ کیا؟ آج تو یہ مثل ہی بدل کر تین لہار کی ہوگئی۔

بایاں ہاتھ۔۔۔۔۔چپاک

داہنا ہاتھ۔۔۔۔۔چپاک

یہ دونوں بھی بالکل پہلے کی طرح۔ذرہ برابر نہ کمی، نہ زیادتی۔اب دوسرے طالب علم کو، پھر تیسرے کو۔پورے انصاف کے ساتھ سب کو تین تین ملتے گئے اور سب یکے بعد دیگرے سی سی کرتے، ہاتھ سہلاتے اور اشک چھپاتے باہر آئے۔کوئی کسی پر تبصرہ نہیں کر رہا، سب گردن جھکائے ہاسٹل پہنچ گئے۔

یہ ۱۹۹۹ء کے سالانہ امتحان سے دو ایک روز پہلے کا واقعہ ہے۔جامعہ کے قانون کے مطابق تمام طلبہ کو کلاس وائز کسی ایک استاذ سے اپنے بال چیک کرانے ہوتے۔بال اتنے چھوٹے ہونے تھے کہ پکڑنے میں نہ آئیں۔بس یوں سمجھیں کہ آرمی اسٹائل کا جو پیچھے والا حصہ ہوتا ہے، اسی کو پورے سر پر برقرار رکھنا تھا۔ہماری جماعت کے نگراں حضرت مولانا ناظم علی مصباحی تھے۔میں حضرت سے معافی کی امید کے ساتھ یہ سطریں لکھ رہا ہوں کہ ایک بچے کے ذہن پر اس واقعے کا جو منفی اثر ہوسکتا تھا، میرا ذہن بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔میں اللہ پاک سے دعائیں کیا کرتا تھا: یا اللہ! میری گھنٹی ان کے پاس نہ پڑے۔لیکن جب ہم سالانہ چھٹی گزار کر واپس جامعہ آئے، تو یہ دیکھ کر میرے غم کی انتہا نہ رہی کہ اس سال میری شرح جامی کی گھنٹی مولانا ناظم صاحب کے پاس ہی پڑ گئی تھی۔بہت دکھ ہوا۔لیکن دو چار روز بھی نہ گزرے کہ حضرت مصباحی صاحب کے اذن سے جماعت کے بہت سے طلبہ نے اس سال شعبۂ قرأت میں بھی داخلہ لیا، جن میں ایک میں بھی تھا۔اس کی وجہ سے پھر مصباحی صاحب کو دوبارہ گروپ بندی کرنی پڑی، جس کا اثر یہ ہوا کہ اب میری گھنٹی حضرت نصیر ملت کے یہاں پڑ گئی۔بڑی خوشی ہوئی۔دل ہی دل میں اللہ کریم کے لطف خاص کا شکر ادا کیا اور کسی قدر مستجاب الدعوات ہونے کی خوش فہمی بھی پال لی۔

نصیر ملت حضرت مولانا نصیر الدین ، جامعہ اشرفیہ کی ارواح ثلاثہ میں سے ایک ہیں۔ اس تثلیث کے دو دوسرے زاویے، بابا حضرت مولانا اسرار صاحب اور دادا حضرت مولانا عبدالشکور صاحب تھے۔ ان تینوں نفوس قدسیہ کا طلبہ کے دل میں خصوصی احترام تھا۔ یہ ایسے ارواح تھے، جہاں نفس کا گزر ہی نہیں تھا۔ جامعہ کی سیاست حاضرہ سے بالکل بے تعلق، جاہ ومنصب کی فکر سے مکمل بے نیاز۔ ایسے لوگ ہی تو اہل اللہ ہوتے ہیں۔ نفس سے بڑھ کر شیطنت اور روح سے بڑھ کر ولایت کا کوئی اور منبع ہو بھی کیا سکتا ہے؟ مجھے فخر ہے کہ میرے اساتذہ میں ایسے بندگان بے نفس بھی رہے ہیں۔

مولانا نصیر ملت ، حافظ ملت کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، گٹھا بدن، گورا رنگ، پتلے ہونٹ، چمکتے دانت، چلیں تو باد صبا ساتھ چلے، رکیں تو زمانہ اپنی سانسیں روک لے، بولیں تو کانوں میں رس گھولیں، ہلکی آواز، دھیما انداز، لفظوں کے ساتھ ذرہ برابر نہ بخل، نہ اسراف، ان کی آواز کی یہ کرامت کہ پہلی لائن میں بھی اتنی ہی آواز اور آخری لائن میں بھی اتنی ہی آواز، یہ درس گاہ نہیں، کسی درویش کی تربیت گاہ ہے، ذرہ برابر شور نہیں، آواز نہیں، طلبہ ایک ایک لفظ پر کان دھرے ہوتے ، کیوں کہ اس درس گاہ میں ایک لفظ دو بار نہیں بولا جاتا۔ ایک لفظ اگر آپ نے مس کیا، تو پھر آج کا سبق سمجھنے سے رہ گئے۔ عبارت خوانی کے بعد ایک مضمونِ درس پر شستہ، شائستہ، انتہائی مختصر، انتہائی جامع ، ایک تقریر ہونی ہے، پھر متعلقہ عبارت کا کوثر وتسنیم میں دھلا ہوا ترجمہ، بات پوری واضح ،سوال کی حاجت نہیں۔ اب اگلی عبارت، پھر اس کی تقریر اور اس کا ترجمہ۔ یہ گنگا کے دھارے ہیں جو بڑی خاموشی کے ساتھ بہتے جاتے ہیں اور فطرت کے قصے سناتے جاتے ہیں۔

حضرت نصیر ملت کے برخلاف، دادا کی آواز بڑی بھاری، پھنسی ہوئی اور گرج دار ہے۔ خوش ہوتے ہیں تو دونوں ہاتھ اپنے زانوؤں پر مارتے ہیں۔ عبارت خواں ، اگر عبارت پڑھتا ہوا آگے بڑھ گیا تو فوراً ایک بھاری آواز آئے گی۔ بسسس ! چل بیٹا۔۔۔ اب دیکھ۔۔۔ یہاں آپ تحت لفظ ترجمہ کا لطف لیں گے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول۔

تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ فرماتے۔

درس کے بعد سوال کرنے کی پوری آزادی ہے، لیکن یہ آزادی صرف آج ہی کے لیے ہے۔ کل اگر آپ نے پوچھا تو دادا مسکرائیں گے اور ایک خاص انداز میں ہونٹ کو دانتوں سے بھینچتے ہوئے ارشاد فرمائیں گے: کل کہاں تھا بیٹا؟ چل آگے دیکھ۔

گستاخی معاف! دادا اپنی تمام تر محبتوں اور خوبیوں کے باوصف نمبر دینے میں انتہائی بخیل مانے جاتے ہیں۔ ایک قصہ مشہور تھا کہ دادا کسی کی کاپی چیک کرتے ہوئے بہت خوش ہو گئے۔ کہنے لگے: سالا بہت اچھا لکھا ہے۔ دل خوش ہو گیا۔ جا ۵۳ نمبر دے دیا۔ علامہ ضیاء المصطفیٰ کے بعد شیخ الحدیث کا منصب دادا کو ہی تفویض ہوا۔ انہوں نے ہی ہمیں بخاری کا درس دیا۔

مولانا عبدالشکور صاحب کی ایک یاد اس حوالے سے بھی ہے کہ اشرفیہ میں انہی کے واسطے سے مولانا وحید الدین خان کا الرسالہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے پاس الرسالہ آیا کرتا تھا۔ دہلی جانے کے بعد پتہ چلا کہ الرسالہ کے منیجر گیا بہار کے ہیں اور وہ حضرت مولانا کے دور کے رشتے میں آتے ہیں۔ غالباً وہ حضرت کو مفت الرسالہ بھیجتے رہے ہوں۔ مولانا ظفر الدین برکاتی اور مولانا رفعت رضا نوری دادا کے پاس سے الرسالہ لاتے اور اسے ہم لوگ پڑھتے۔ رفعت صاحب نے بتایا کہ ایک دن دادا نے فرمایا:

''بچ کے پڑھنا بیٹا۔ بہت سٹا کے مارتا ہے۔''

الرسالہ کی مغالطہ آمیزیاں دیکھنے کے بعد مجھے منطق کی قدر و قیمت سمجھ میں آئی۔ الرسالہ کے مطالعے کے دوران ہی یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر غلط بات اس قدر سلیقے اور معقولیت سے کہی جا سکتی ہے، تو اچھی بات سلیقے اور معقولیت سے کیوں نہیں کہی جا سکتی؟

بابا مولانا اسرار کی شخصیت نیاز بے نیاز تھی۔ گجھڑا سے سائیکل سے روزانہ وقت پر چلے آتے۔ لمبا قد، صحت مند بدن، بھاری آواز، سر سید کی داڑھی۔ تحت لفظ ترجمہ میں آپ بھی اپنی مثال آپ۔ ان کی درس گاہ میں: ''تھا، بادشاہ ایک ظالم، جو کرتا تھا چُرایا، گدھا رعایا کا۔'' یہ اور اس طرح کے جملوں سے ہر دن لطف اٹھائیے۔

بابا کا انداز سب سے نرالا۔ سر جھکا کر آدھی تقریر، اس کے بعد اچانک گردن گھما کر بلند آواز کے ساتھ اپنا اصل مدعا۔ بابا انسانی نفسیات اور معاشرے کا بھی گہرا تجزیہ رکھتے

ہیں۔ ایک بار فرمانے لگے۔ کتوں کا بھی موسم ہوتا ہے، لیکن انسانوں کا تو موسم بھی نہیں ہوتا۔ اگر انسان اپنی ملکوتی قوتوں کو صیقل نہ کرے تو وہ کتوں سے بھی بدتر ہے۔ ایک بار فرمانے لگے: لوگ مولوی کو سمجھتے کیا ہیں۔ سادہ، شریف، بے وقوف۔ پتہ نہیں اور کیا کیا؟؟ اور تو اور۔ ایک گاؤں میں مولوی صاحب کی شادی ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ان کی اہلیہ امید سے ہوگئیں۔ جب بات نمایاں ہوئی، محلے کی عورتیں نکڑ پر بیٹھے آپس میں کہنے لگیں:

''چھی، چھی، حافظ صاحب بھی۔۔۔ ہم لوگ تو ان کو بہت شریف سمجھتے تھے۔''

۲۰۰۲ء میں سادسہ کا طالب علم تھا۔ شروع سال میں ہی مجھے زور کا جھٹکا لگا۔ مختصر المعانی کی گھنٹی حضرت مولانا ناظم علی مصباحی کے پاس پڑ گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بڑی مشکل سے ان کی درس گاہ میں حاضر ہوا۔ سینے پر پتھر رکھ کر ان کی تقریرِ درس سنی۔ مگر رفتہ رفتہ میرے کان مانوس ہوتے گئے اور دل میں حضرت مولانا کے لیے بڑی جگہ بن گئی۔ قریب جا کر اندازہ ہوا کہ مولانا بڑے بے نفس، سادہ لوح، مخلص، بے ضرر، نیک اور شریف انسان ہیں۔ اپنے فرائض بڑی ذمہ داری سے ادا کرتے ہیں اور جو کتاب پڑھاتے ہیں وہ پوری کتاب گویا پہلے سے ان کے ذہن میں ریکارڈ ہوتی ہے۔ طلبہ کی رائے تھی کہ حضرت کی خانگی زندگی بھی بڑی سادہ مگر مسرتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ حضرت کبھی کبھی تو پان منگواتے، لیکن جب بھی منگواتے مسکراتے ہوئے ایک ساتھ دو منگواتے، جن میں ایک میٹھا ہوتا۔

اساتذہ کی لمبی فہرست ہے، جن پر ابھی گفتگو مزید ہوتی رہے گی۔ لیکن اب ذکر کچھ آشفتہ سروں کا:

❁❁❁❁

ساتواں منظر

رندانِ خرابات

میری جماعت میں زاہدوں، صوفیوں، کاتبوں، شاعروں، کتابیوں اور پڑھاکوؤں کے ساتھ رندوں، مسخروں، آواروں اور خراباتیوں کا بھی اجتماع ہو گیا تھا۔ سرفراز، عارف اقبال، رضاء اللہ اور جاوید جیسے ارباب ذوق اس انجمن کی شمع فروزاں کی حیثیت رکھتے تھے۔ آج انہی کے نامۂ اعمال سے کچھ سیاہی مستعار لے کر عہد رفتہ کی یادیں قلم بند کرتے ہیں۔

خامسہ/ ۲۰۰۱ء کے سال اشرفیہ کی تدریسی تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا۔ حضرت مصباحی صاحب نے ٹیچر ٹریننگ کے نام پر نئے فارغین کو اشرفیہ میں قلیل المدتی تدریس کا موقع عنایت فرمایا۔ غالباً اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ان تربیتی اساتذہ میں سے انہیں اشرفیہ کے لیے بعض جوہر قابل مل جائیں اور جن کو اشرفیہ میں مستقل جگہ نہ مل سکے، انہیں اشرفیہ میں تدریسی تجربہ کے سبب دیگر بڑے مدارس میں تدریس کے مواقع میسر آجائیں۔ مولانا معین الدین مصباحی، مولانا شبیر مصباحی، مولانا ناظم علی مصباحی اور مولانا مکرم مصباحی کی پہلی کھیپ میں بحالی ہوئی۔ ان سے 'شرف تلمذ' ہمیں بھی حاصل ہوا جسے۔ نقلِ کفر کفر نباشد۔ بعض طلبہ 'مشق ستم' سے بھی تعبیر کرتے تھے۔ ان اساتذہ نے جس محنت اور محبت و اخلاص سے ہمیں پڑھایا، نوک خامہ اس کے تشکر و امتنان کے لیے سجدہ ریز ہے۔ اپنی جماعت کے شرفا کی شرافتوں کے لیے میں نے اس وقت بھی ان سے معافی مانگی تھی اور آج بھی بعض شرافتوں کے لکھنے سے قبل ایک بار پھر ان سے معافی کا خواست گار ہوں۔

اب کسی کا نام لیے بغیر آگے کی کہانی سنیے:

یہ تمام کلاسیز دارالتجوید میں ہوتی تھیں۔ اگر آپ مین گیٹ سے اشرفیہ میں داخل ہوتے ہیں تو گنبد کے پاس سے لیفٹ ہو جائیں۔ جہاں سینٹرل بلڈنگ کا جنوبی دستہ ختم ہوتا ہے، وہیں سے رائٹ مڑ کر قبلہ رخ ہو کر چل دیں۔ اب ایک ترچھی نظر اپنی بائیں طرف ڈالیں۔ آپ کے بائیں ہاتھ پر ایک لمبی، خوب صورت، دومنزلہ عمارت آپ کے ساتھ ساتھ چلتی نظر آئے گی۔ یہی دارالتجوید ہے۔ عمارت کے وسط میں اس کا انٹری گیٹ اور زینہ ہے۔ اگر آپ سیدھے آگے بڑھتے چلے جائیں تو اس کے اختتام پر بائیں جانب امام احمد رضا لائبریری ہے۔ دارالافتا اور مجلس برکات کو بھی اسی میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ داہنے ہاتھ پر عزیز المساجد ہے، جو عہد زوال میں مسلم تہذیبی ارتقا کی داستان سناتی ہے۔ مسجد اور لائبریری کے بیچ سے آپ سیدھے جانب مغرب آگے بڑھ جائیں تو سو قدم چل کر آپ فیملی کوارٹر میں آ جائیں گے۔ اب تھوڑا پیچھے آئیں۔ مسجد کے جنوب مشرقی گوشے سے چل کر شمال مشرقی گوشے پر آئیں۔ یہیں حافظ ملت کا خوب صورت مربع روضہ ہے۔ ذرا غور سے سنیں۔ اندرون روضہ سے ایک ہلکی سی آواز سنائی دے گی: ''ہر مخالفت کا جواب کام ہے''۔

جنوبی دروازے سے مزار میں داخل ہوں، فاتحہ پڑھ کر نصف طواف کے ساتھ مشرقی دروازے سے باہر آ جائیں۔ اگر بھوک زیادہ لگی ہے تو مزار سے نکلتے ہوئے لیفٹ ہو جائیں اور شمال کی طرف گھوم کر دو سو قدم چلیں۔ ہندوستانی پارلیامینٹ کی شکل میں احسن العلماء ڈائننگ ہال سامنے نظر آئے گا۔ لیکن یاد رکھیں یہاں کھانے کا وقت مقرر ہے۔ یہاں ہر وقت آپ کو کھانا نہیں ملے گا۔ اس سے مشرق کی جانب جدید ہاسٹل یا برکاتی ہاسٹل ہے۔ مزار حافظ ملت کے مشرقی دروازے سے نکلتے ہوئے ٹھیک سامنے اشرفیہ کا سب سے بڑا اور قدیم دارالاقامہ عزیزی ہاسٹل ہے۔ آپ اس کے اندر نہ جائیں، اس لیے کہ اگر آپ اس کے اندر چلے گئے تو اس کے اندر داخل ہوتے ہی ناک کی سیدھ پر اس کا مشرقی دروازہ نظر آئے گا، جہاں نکلنے کے بعد اگر مزید مشرق کی طرف چلتے رہے تو اشرفیہ سے باہر سڑک پر آ جائیں گے۔ اگر تھکے نہیں ہیں تو عزیزی ہاسٹل کے مشرقی دروازے سے نکلتے ہی رائٹ ہینڈ پر مڑ کر دیکھیں، سینٹرل بلڈنگ کا شمالی دستہ شروع ہوتا دکھائی دے گا، جس کا پہلا کمرہ مولانا اختر کمال صاحب کا ہے، جس کے اندر اگر آپ نے جھانکنے کی کوشش کی تو محبت کے ساتھ ایک آواز آئے گی۔ ''کون جھانک رہا ہے بے بانر!''

آپ سینٹرل بلڈنگ میں اِن کر جائیں اور پھر جانب جنوب چلتے ہوئے پوری بلڈنگ کراس کر جائیں۔ اب پھر آپ لوٹ کر دارالتجوید آ گئے۔ جس کی دوسری منزل پر یہ تمام نئی درس گاہیں لگی ہوئی ہیں۔

اندر ابھی دوسری جماعت کی کلاس چل رہی ہے اور ہماری جماعت کے بعض شرفا باہر مونگ پھلی بیچ رہے ہیں۔ اس سال چند نئے طلبہ ہماری جماعت میں داخل ہوئے ہیں، جن میں حافظ رافت، ظفر الدین برکاتی اور توفیق برکاتی نمایاں ہیں، جو ایک ساتھ جہاں گیر گنج سے آئے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک طالب علم جو آدم بے زار قسم کا پڑھا کو ہے، ایک کونے میں کھڑا عبارت حل کرنے میں مصروف ہے۔ ایک پرانا طالب علم مونگ پھلی بیچتا ہوا اس کے پاس جاتا ہے:

''اومولی صاحب! تمہار گھر کہاں ہے؟''

نو وارد طالب علم پان کی پیک کے ساتھ اپنا غصہ نگلتے ہوئے جواب دیتا ہے:

''کلکتہ!''

''اومولی صاحب! ہمارا گھر بھی کلکتہ ہے اور ہماری طرح تم بھی موٹے اور کالے ہو۔ پتہ کرو، ضرور ہمارا اور تمہارا باپ کوئی ایک ہی ہوگا۔''

نو وارد طالب علم غصے سے اسے دیکھتا ہے، نہ چاہ کر بھی مسکراتا ہے اور پھر اپنی کتاب میں گھس جاتا ہے۔ تبھی ایک دوسرا طالب علم پہنچتا ہے:

''اومولی صاحب! آپ کی مونچھ تو بڑی زبردست ہے۔ آپ لالو کی پارٹی کیوں نہیں جوائن کر لیتے۔ آپ تو دونوں طرف ایک ایک لالٹین لٹکا سکتے ہیں۔''

اتنے میں گھنٹی بجتی ہے۔ پچھلی کلاس والے باہر نکلتے ہیں اور ہم لوگ کلاس میں داخل ہوتے ہیں۔ حسب معمول عبارت خوانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد استاذ پوری محنت اور محبت سے اپنی تقریر کرتے ہیں۔ استاذ کی تقریر کے بعد معقول و نامعقول سوالات کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ ایک دن تو ہمارے ساتھیوں نے دیوان متنبی کے درس میں حد کر دی۔ اتنے سوالات پوچھے کہ استاذ کو یہ کہنا پڑا:

''اِنی لا أُعلِّمُکم بل أَتعلَّمُ مِنکم''

ایک دن طلبہ نے اتنا زیادہ پریشان کر دیا کہ ہڑبڑاہٹ میں یہ بول گئے:

''باندی چاہے آقا ہو یا غلام''

اب حاضری کی باری آتی ہے۔ اب تک جو نصف سے زائد کمرہ خالی تھا، اچانک بھرتا چلا جاتا ہے۔ جو حضرات ابھی بھی باہر مونگ پھلی اور چائے بیچ رہے تھے، وہ سر جھکائے دبک کر کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی حاضری بول بول کر باہر آجاتے ہیں۔ بعض فنکار وہ بھی ہیں جو آواز بدل کر اکیلے ہی دو دو تین تین کے نام پر لبیک بول جاتے ہیں۔

چوں کہ آدھے بچے درس کے وقت باہر ہی کھڑے رہتے، لہٰذا باقی جو بچے درس میں بیٹھتے تو پھیل کر اور کشادہ ہو کر بیٹھتے، جس کی وجہ سے اچانک باہر والوں کو اندر بیٹھنے کی ضرورت پیش آتی تو جگہ نہیں ملتی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ معائنے کے لیے اچانک حضرت مصباحی صاحب آگئے اور اس نازک گھڑی میں بچے ایک دم سے حیران و پریشان کچھ اندر اور زیادہ تر دروازے کے باہر چپلوں پر گردن جھکائے بیٹھ گئے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے جو ایسے لمبی گردن سے آگے جھانکتے جیسے سچ میں کسی ساتھی کی کتاب میں نظر جمائے ہوئے ہوں، جب کہ دور دور تک ان میں سے کسی کے پاس کتاب نہ ہوتی۔

مصباحی صاحب بسا اوقات بہت قریب آکر سب کو دیکھتے اور مسکراتے گزر جاتے اور بچے بے چارے مارے شرم کے سر چھپائے رہتے جیسے زمین میں دھنسے جا رہے ہوں۔

طلبہ کی ان حرکتوں کو دیکھ کر استاذ بہت کڑھتے۔ آخر ایک دن انہیں اعلان کرنا پڑا:

''کل سے حاضری شروع میں ہوگی۔''

پھر کیا تھا۔ دوسرے دن شروع میں ہی کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، لیکن اس دن کا سانحۂ روح فرسا لکھتے ہوئے خامۂ دل فگار انتہائی شرمندہ ہے کہ اس دن جب استاذ کتاب پڑھا کر فارغ ہوئے تو اس سے پہلے ہی آدھے سے زیادہ کمرہ خالی ہو چکا تھا۔

ایک دن جب وقت ہو گیا اور کچھ طلبہ اندر آگئے تو استاذ محترم نے درس شروع کرنے سے پہلے اندر سے دروازہ بند کرا دیا اور آخر تک نہ کھولا۔ درس کی تکمیل اور حاضری

کے بعد دروازہ کھولنے کو کہا تو پتا چلا کہ دیر سے آنے والے طلبہ باہر سے بند کر گئے ہیں۔اب کیا تھا،طلبہ کی ہنسی ہے جو رکنے کا نام نہیں لیتی اور استاذ محترم کا چہرہ ہے جو غصے اور ندامت میں لال پیلا ہو چلا ہے۔آخر یہ ترکیب بھی کارگر نہ ہوئی۔

استاذ ایک دن بہت غضب ناک تھے۔کہنے لگے:''سنو!تم لوگ اشرفیہ میں ابھی پڑھ رہے ہو اور میں پڑھ چکا ہوں۔مجھ سے زیادہ استاذی نہ کرو۔مجھے سب کو ٹھیک کرنا آتا ہے۔کل سے میری مرضی،میں شروع میں حاضری لوں یا آخر میں یا دو بار لوں۔جس کو اپنی حاضری فی صد سلامت رکھنی ہے،وہ شروع سے آخر تک رہے،باقی وہ جانے،میں اس کا ذمہ دار نہیں۔''

طلبہ کو بھی اب اندازہ ہو گیا تھا کہ مزید شرارت مناسب نہیں۔ورنہ اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔چنانچہ کئی دنوں تک پوری کلاس شروع سے آخر تک بھری رہی۔سارا معاملہ شانتی پُروَک چل رہا تھا،لیکن ایک دن میری حیرت وافسوس کی انتہا نہ رہی،جب کلاس ختم ہونے کے بعد استاذ سب کو روانہ کر کے اکیلے میں مجھ سے کہنے لگے:

''ان کمینوں کو سمجھائیے،انہوں نے میری ناک میں دم کر دیا ہے۔یہ میرے گھڑے کا سارا پانی پی جاتے ہیں۔ٹیفن کا کھانا کھا جاتے ہیں۔میں نے کھانا لانے والے کو سمجھایا کہ اس کلاس کے ختم ہونے کے بعد کھانا لایا کرو۔اب کل پرسوں سے آدھی آدھی کلو پیاز کاٹ دیتے ہیں۔میرا اچار کھا جاتے ہیں۔رات کا بھگویا ہوا چنا چٹ کر جاتے ہیں۔''

استاذ یہ کہتے ہوئے قریب تھا کہ رو پڑتے۔میں نے انہیں تسلی دی اور یقین دلایا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔میں نے بڑی منت سماجت سے ہاتھ پیر جوڑ کر اپنی جماعت کے شرفا سے ان حرکات سے باز رہنے کی گزارش کی،جس کی بڑی حد تک انہوں نے لاج بھی رکھی۔

بقول شخصے،دراصل معاملہ یہ تھا کہ اساتذۂ گرامی نئے ہونے کے باوصف کچھ زیادہ ہی علمی وتدریسی صلاحیت کی دھاک بٹھانا چاہتے تھے اور وہ یہ بھول گئے کہ کبھی وہ بھی اسی دشت جنوں کے سیاح تھے اور یہ کہ آنے والی نسلیں بہت سے معاملات میں نظریۂ ارتقا کے مطابق ترقی پذیر ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک روایت کے مطابق مولانا ساجد مصباحی صاحب جو اِس وقت اشرفیہ میں مستقل استاذ کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں،

انہوں نے طلبہ سے پنگا لینے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جو چاہے جب آئے یا نہ آئے، درس سنے نہ سنے، یا صرف حاضری کے لیے ہی اندر داخل ہو، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ راوی کے بقول ان کی خود سپردگی نے طلبہ کو بھی رام ہونے پر مجبور کر دیا۔

ہماری جماعت کے شرفا نے نئے اساتذہ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی کر دیا تھا۔ وہ قدیم اساتذہ کی بارگاہ میں اتنے جری تو نہ تھے، تاہم وہ ان کی درس گاہوں میں بھی کچھ نہ کچھ کر ہی جاتے۔ مثال کے طور پر حضرت مولانا زاہد سلامی صاحب کی درس گاہ کا ایک قصہ سنیے:

مولانا زاہد سلامی صاحب انتہائی خلیق، متواضع اور خوش مزاج آدمی ہیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی ہر وقت تیرتی رہتی ہے۔ سنجیدہ باتوں میں مزاح لطیف کا پہلو پیدا کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ لیکن اس سب کے باوجود ہماری جماعت کے شریفوں نے ایک دن ان کے پیمانۂ صبر کو بھی لبریز کر دیا۔ قدوری کا درس چل رہا تھا۔ نواقض وضو کا بیان تھا۔ جوں ہی مولانا نے ''ماخرج من السبیلین'' کا ترجمہ کیا۔ ایک من چلے نے ایک سیدھے سپاٹ طالب علم سے سرگوشی کی:

''حضرت سے پوچھو، سبیلین کیا ہوتا ہے؟''

اتفاق سے حضرت نے انہیں یہ کانا پھونسی کرتے دیکھ لیا۔ ''جی کیا ہو رہا ہے؟''

''حضرت یہ سبیلین کے معنی پوچھ رہے ہیں۔'' من چلے نے کیس کو شریف کے سر ڈال دیا۔ پھر کیا تھا۔ حضرت غضب ناک ہو گئے اور اس شریف بے چارے کو آناً فاناً دو چار ڈنڈے طبیعت سے رسید کر دیے۔ اس قدر غصے میں تھے کہ اس بے چارے کا بیانِ صفائی بھی نہ سن سکے۔ اس بے چارے پر دوسرا ظلم یہ ہوا کہ جماعت کے طلبہ اس کا نام ہی بھول گئے اور آخر تک اسے ''سبیلین'' ہی پکارتے رہے۔ سبیلین بھائی! اگر آپ کی نگاہ سے یہ سطریں گزریں تو مجھے ضرور معاف کر دیجیے گا، جیسے زمانۂ طالب علمی میں معاف کرتے رہے۔

اشرفیہ میں ہماری طرح کچھ طلبہ ہی ایسے بے ذوق تھے، جو ایک کلاس مکمل کرنے کے بعد دوسرے استاذ کے کمرے میں دوسری کلاس کے لیے فوراً داخل ہو جاتے۔ عام طور سے جو باذوق طلبہ ہوتے، وہ ایک کلاس کرنے کے بعد دوسری کلاس کے باہر کھڑے ہو کر تھوڑی دیر تک حالات حاضرہ کا تجزیہ کرتے اور پچھلی درس گاہ میں جو زائد معلومات پی

چکے ہوتے اسے تحلیل ہونے کا موقع فراہم کرتے۔ بعض طلبہ وہ بھی ہوتے جو اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے باہر چائے پینے چلے جاتے۔ اب ادھر سے چائے پی کر تازہ دم ہو کر آتے، دروازے کے پاس بیٹھتے اور سر جھکا کر آہستہ سے اندر گھس جاتے اور بڑی سنجیدگی سے اپنی حاضری بول کر واپس آجاتے۔ ایک دن حضرت مصباحی صاحب دروازے پر بیٹھے طلبہ کو مخاطب کر کے کہنے لگے:

''آپ حضرات ذرا اور اندر آجائیں، کچھ لوگ ابھی باہر چائے پی رہے ہوں گے، ان کے لیے بھی تو جگہ چاہیے۔''

اشرفیہ میں گزرے ہوئے ایام کا لمحہ لمحہ یاد آتا ہے۔ وہ لمحات ہمیں ہنساتے بھی ہیں اور رلاتے بھی ہیں۔ بات سے بات نکلتی ہے اور پھر دور تک چلی جاتی ہے۔ ایک سرے کو سمیٹتے ہیں تو دوسرا سرا چھوٹ جاتا ہے۔

❁❁❁❁

دھنک رنگ

۱۹۹۹ء میں اشرفیہ میں ہماری صبح محترم مولانا صوفی خورشید کی صدائے دل نواز سے ہوتی تھی۔ صوفی صاحب درجۂ خامسہ کے طالب علم تھے۔ نیک اور شریف۔ اذان خانے میں رہتے تھے۔ اکثر و بیشتر اذان بھی وہی دیتے۔ دعوت اسلامی سے متاثر تھے اور کسی قدر منسلک بھی۔ اذان دینے کے بعد بڑی تیزی سے ہاسٹل، سینٹرل بلڈنگ اور دارالتجوید کا ایک چکر لگاتے۔ ہر دروازے پر زور زور سے کنڈی ہلاتے جاتے اور بلند آواز سے ایک خاص آہنگ میں پڑھتے جاتے:

لگا تکیہ گناہوں کا پڑا دن رات سوتا رہتا ہے
اسے بھی خواب غفلت سے جگادو یا رسول اللہ!
الصلاۃ و السلام علیک یا رسول اللہ!

طلبہ نے مشہور کر رکھا تھا کہ صوفی صاحب یہ شعر حضرت مصباحی صاحب کے دروازے کے سامنے بھی پڑھتے ہوئے گزرتے ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مصباحی صاحب فوراً سے پیشتر بستر ہی نہیں چھوڑتے، کمرہ چھوڑ کر باہر آجاتے ہیں۔ بیشتر طلبہ کے لیے صوفی صاحب کی یہ تذکیر، لوری ثابت ہوتی اور کروٹ بدل کر پھر دراز ہوجاتے۔ اس کے بعد اچانک بچوں کے بھاگنے کی آواز آتی۔ مطلب صاف ہوتا کہ ماسٹر فیاض صاحب تشریف لا چکے ہیں۔ طلبہ تیزی کے ساتھ بستر چھوڑتے اور طہارت خانوں اور وضو خانوں کی طرف نکل پڑتے۔ ان میں بعض طہارت خانوں کے سامنے لائن میں کھڑے ہوتے، تو

بعض کسی دیوار سے ٹیک لگائے اپنی نیند پوری کر رہے ہوتے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک آواز سنائی دیتی:

''ابے! تو لوگ ابھی بوروس کر رہا ہے!'' ماسٹر صاحب کا یہ دوسرا دورہ ہوتا۔

اس کے بعد ہاسٹل خالی ہو جاتا تھا۔ اگلے پانچ منٹ کے بعد ماسٹر صاحب کی آواز نہیں آتی، اب ان کا ڈنڈا چلتا اور باقی ماندہ طلبہ ایک کونے سے دوسرے کونے میں بڑی تیزی سے بھاگ رہے ہوتے۔ ماسٹر صاحب نے ایک بار جس قوت سے میرے پیروں پر اپنا ڈنڈا اچھالا تھا، میں نے اگر jump نہ لگایا ہوتا تو میرے پاؤں کا شدید طور پر زخمی ہو جانا یقینی تھا۔ پانچ سات میٹر کے فاصلے سے انہوں نے ڈنڈا اچھالا تھا اور میرے jump کر جانے کے بعد کافی دور جا کر ڈنڈا گرا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ماسٹر صاحب سے کبھی فیض یاب ہونے کا موقع نہیں ملا۔

۲۰۰۰ء یا اس کے بعد سے ہاسٹل میں ایک دوسری منحنی صدائے الرحیل بھی سنائی دینے لگی۔ یہ مفتی نسیم صاحب تھے جو ڈنڈے کی جگہ کراٹے کا استعمال کرتے۔ کراٹے سے مراد یہاں صرف اتنا ہے کہ مفتی صاحب کسی بھی طالب علم کا بازو اپنے بازو میں جکڑ لیتے اور اپنا پنجہ کھڑا کر کے اس کے بازو پر زور سے مارتے۔ مجھے یاد ہے کہ عزیزی ہاسٹل کے روم نمبر ۳۷ میں دروازے کے پاس علامہ ارشاد نعمانی کا بستر ہوتا اور روم کے دوسرے کنارے پر میرا بستر ہوتا۔ علامہ نعمانی قابل رشک ہیں کہ مفتی صاحب کے وہ فیوض و برکات جو اس کمرے کے لیے مختص تھے، ان کا اسی نوے فیصد حصہ اکیلے ان کے دامن مراد میں آیا۔ چوں کہ پہلا بستر انہی کا تھا، اس لیے مفتی صاحب بسم اللہ انہی سے پڑھتے اور اگر کبھی دوسروں کی طرف بڑھے تو بھی علامہ کی نیند اتنی گہری ہوتی کہ ان کے حصے کا تبرک پورا پورا انہیں ضرور مل جاتا۔ مفتی صاحب مجھ کو فیض یاب کرنے کے بڑے آرزومند تھے، لیکن افسوس کہ ان کی آرزو، ۶ رسالہ مدت قیام تک آرزو ہی رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مفتی صاحب کا اصول کراٹا یہ تھا کہ جس ایک کو پکڑ لیا مسلسل اسی کو نوازتے رہتے۔ دریں اثنا میں آسانی سے نکل جاتا اور اگر خصوصی طور سے میرا قصد فرما کر میری طرف آتے تو میں سیدھا سپاٹ بنا، احمق کی طرح منہ لٹکائے کھڑا ہو جاتا، گویا مشق ستم بننے کے لیے پوری طرح تیار

ہوتا، لیکن جوں ہی مفتی صاحب قریب آتے، تیزی سے بیٹھتا اور آنکھ جھپکتے ہی دروازے سے باہر ہوتا۔ ایک دو بار تو میری کلائی بھی مفتی صاحب کے ہاتھ میں آئی لیکن ان کی گرفت مضبوط ہونے سے پہلے ہی آزاد ہوگئی۔ میری فنکاری سے بہت سے قریبی دوست واقف تھے۔ ایک روز ہمارے ہم درس جناب شمس الدین برکاتی بھی میری نقالی کرنے کی غلطی کر بیٹھے۔ لمبے آدمی تھے، بے چارے پکڑ گئے۔ اب جوان پر مفتی صاحب کا خصوصی فیضان ہوا، اس کی الگ داستان ہے۔ بروایت مولانا رفعت رضا نوری، اسی سے ملتی جلتی خبر علامہ ارشاد کی بھی موصول ہوئی ہے۔ اُس شب علامہ صاحب مولانا رفعت کے کمرے میں آرام فرما رہے تھے۔

انیسویں صدی کے ربع اول میں سرزمین ہندوستان وہابی تحریک سے متاثر ہوئی، جس کی آب یاری شاہ اسماعیل ابن شاہ عبدالغنی ابن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اوران کے متبعین نے کی۔ ۱۸۶۷ء سے شروع ہونے والی دیوبندی تحریک بھی اس سے متاثر ہوئی۔ دیوبندیت کے بانیان مولانا قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی اور اشرف علی تھانوی وغیرہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے مریدین وخلفا تھے۔ امکان کذب اور امکان نظیر جیسے نظریات کے ساتھ عرس وفاتحہ، سماع اور میلاد وقیام جیسے روایتی صوفی معمولات کے حوالے سے بھی یہ حضرات وہابی فکر سے متاثر ہوئے، جس کے نتیجے میں حاجی امداد اللہ صاحب کے ہی دیگر خلفا مثلاً مولانا عبدالسمیع بیدل رام پوری وغیرہ نے ان کا رد بلیغ کیا۔ حاجی صاحب نے ''فیصلۂ ہفت مسئلہ'' کے ذریعے اعتدال اور طرفین کے بیچ مصالحت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

رفتہ رفتہ طرفین کے بیچ فکر وعمل کا بُعد بڑھتا گیا، حتیٰ کہ جو معمولات حلقۂ دیوبند میں پہلے مکروہ وناپسندیدہ تھے، وہ رفتہ رفتہ ناروا، ناجائز اور پھر حرام بنتے چلے گئے اور عوامی سطح پر انہیں بدعت بلکہ شرک کہا جانے لگا۔ اس شدت کے ردعمل میں دوسری طرف وہ بہت سارے معمولاتِ تصوف جو پہلے جائز، اولیٰ یا مستحب کی حد تک تھے، عملاً واجب وفرض اور شعار سنیت بن گئے۔ رفتہ رفتہ سنیت کے اتنے سارے شعارات وجود میں آگئے کہ آج ہر دوسرے شخص کی سنیت خطرے میں نظر آتی ہے۔

اشرفیہ کی نماز فجر اور نماز جمعہ میں شرکت کرنے والے گاؤں کھیڑے کے مضبوط سنیوں کو شدید دھچکا لگتا ہے، جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اہل سنت کے اس عظیم ادارے میں فجر وجمعہ میں صلاۃ وسلام نہیں ہوتا۔ اساتذہ اور طلبہ نماز پڑھتے ہیں اور جسے شخصی طور پر صلاۃ و سلام پڑھنا ہوتا ہے، وہ پڑھتا ہے، پھر باہر ہو جاتا ہے۔ وہاں صلاۃ وسلام کا اجتماعی نظم نہیں ہوتا، جب کہ ملک کے بہت سے مقامات پر اذان سے پہلے، اذان کے بعد، اقامت سے پہلے، فجر کے بعد اور بہت سی جگہوں پر عصر کے بعد بھی بہ آواز بلند صلاۃ وسلام پڑھنا معمولات واجبہ اور شعارات دینیہ بنتے جا رہے ہیں۔ اللہ ہی خیر کرے۔

نماز فجر کے بعد عزیز المساجد سے نکلنے کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔ عزیز المساجد کے دروازے سے روضۂ حافظ ملت، قدیم وجدید ہاسٹلز اور دار التجوید کے دروازوں تک اور اس سے آگے مین گیٹ تک قطار در قطار طلبہ جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے چیونٹیاں کسی شکار کے پیچھے صفوں میں چلی جا رہی ہوں۔ نماز کے بعد بہت سے طلبہ تلاوت کرنے بیٹھ جاتے ہیں، کچھ روضۂ حافظ ملت میں فاتحہ پڑھنے پہنچتے ہیں، بعض طلبہ اپنی روٹین کے مطابق مطالعے میں لگ جاتے ہیں، بعض لذت کام ودہن کے لیے سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور بعض چادر تان کر دراز ہو جاتے ہیں۔

جامعہ اشرفیہ کا تعلیمی سلسلہ ''مصطفی جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' کے کیف پرور نغمے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد ساڑھے بارہ بجے تک کلاسیز جاری رہتی ہیں۔ ہمارے عہد میں ان اوقات میں بھی سچن تندولکر اور شاہد آفریدی کے بعض دیوانے ہاسٹل کے اندر بیٹھے چائنا سیٹ ایف ایم ریڈیو سے کان لگائے رہتے اور ہر چھکے پر ایسے خوش ہوتے جیسے ٹرافی وصول کرنے انھیں ہی جانا ہو۔ بعض وہ بھی ہوتے جو عزیزی ہاسٹل کے صحن میں کرکٹ کھیلتے رہتے۔ کرکٹ کے یہ ایسے متوالے ہوتے جیسے اب جلد ہی دھونی اور سہواگ کی جگہ انھیں ملنے والی ہو۔

بارہ ساڑھے بارہ بجے چھٹی ہوتی۔ فوج در فوج طلبہ درس گاہوں سے نکل کر ہاسٹل کی طرف اور وہاں سے ٹفن لیے کینٹین کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے۔ بعض مسٹنڈے قسم کے طلبہ ہاسٹل کے گیٹ کے سامنے پارک میں اور پارک کی چہار دیواری پر بیٹھے ہوتے اور

آنے جانے والے خصوصاً نئے اور نوخیز طلبہ پر جملے کس رہے ہوتے۔ یہ طلبہ عام طور پر وہ ہوتے جو بہت سے اساتذہ کے ہم درس معلوم ہوتے اور ایک ایک کلاس میں کئی کئی بار پی ایچ ڈی کر چکے ہوتے۔(۱) بعض طلبہ کے بارے میں خیال تھا کہ قیام اشرفیہ کے کچھ ہی سالوں بعد حضرت کا داخلہ ہوا تھا، تب سے مسلسل پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ بعض ان میں بہت ڈھیٹ ہوتے۔ وہ ہم جیسے نان پی ایچ ڈیز پر طنزیہ جملے کستے: ''ابے! حافظ ملت نے کہا ہے کہ یہاں کا ناکام بھی کامیاب ہے۔ حافظ ملت کو تم لوگوں پر نہیں، ہم لوگوں پر فخر تھا، اسی لیے انہوں نے تمہارا نہیں، ہمارا خصوصی ذکر کیا ہے۔''

احسن العلما ڈائننگ ہال ہمارے سامنے بنا ہے۔ اس سے قبل طلبہ ٹفن میں کھانا لیا کرتے تھے۔ چار چار، چھ چھ طلبہ ایک ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے۔ ایک دسترخوان پر جتنے طلبہ کھانا کھاتے پورے گروپ کا کھانا ایک طالب علم لے کر آتا۔ ماسٹر فیاض کھڑے ہو کر کھانا بٹواتے۔ ایک طالب علم کو دیکھتے ہی فوراً اس کے ساتھ کھانے والے مختلف جماعتوں اور علاقوں کے تمام طلبہ کا کھانا نکالنے کا آرڈر جاری کر دیتے اور فٹافٹ رجسٹر میں ان سب کی حاضری لگا دیتے۔ انھیں یہ بھی پتہ ہوتا کہ کس کے گروپ میں کتنے اور کون کون طلبہ ہیں۔ ان میں سے کون حاضر ہے اور کون غیر حاضر ہے اور جو حاضر ہیں، ان میں کس کا کھانا جاری ہے اور کس کا بند ہے۔ کھانے کی یہ تقسیم بہت تیزی سے ہوتی۔ ماسٹر صاحب کی ذہانت کمپیوٹر میموری سے بڑھ کر تھی۔ ہم لوگوں کو اپنی جماعت کے چند طلبہ کے نام اور تفصیلات معلوم نہ ہوتیں لیکن اس بندۂ خدا کی میموری اور اسکرین اس قدر فاسٹ تھی کہ آج سوچتے ہیں تو یقین نہیں آتا۔

کھانا لینے والے طلبہ لمبی قطار بنائے کھڑے رہتے۔ اگر کسی نے لائن توڑنے کی کوشش کی تو پیچھے سے ''ہٹ، ہٹ، ہٹ، ہٹ'' کا ایسا شور ہوتا کہ بے چارے کا منھ اتر جاتا جیسے کسی نے لیموں نچوڑ دیا ہو۔ پھر وہ واپس اپنی جگہ کھڑا ہو جاتا، لیکن ان میں جو بہت ڈھیٹ ٹائپ کے ہوتے وہ دیگر طلبہ کے ساتھ خود بھی ''ہٹ، ہٹ، ہٹ'' کی آواز بلند کر کے فاتحانہ شان سے window کے پاس پہنچ جاتے۔ اشرفیہ کے محاورے میں اس کے لیے ''ہٹھٹانا''

---

(۱) یہ طلبۂ اشرفیہ کی خاص اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے کسی کلاس میں ناکام ہو کر پھر اسی میں پڑھنا۔

بطور مصدر وضع ہوا تھا، مختلف مواقع پر جس کے مشتقات کا جا و بے جا استعمال ہوتا۔ کچھ طلبہ ماسٹر صاحب کے اسپیشل ہوتے اور ہر موقع پر ان کے ساتھ اسپیشل ٹریٹمینٹ ہوتا۔

جو طالب علم اپنے ساتھیوں کا کھانا لے کر واپس آتا اسے دسترخوان پر اور کوئی کام نہیں کرنا ہوتا۔ اس کے دیگر ساتھی برتن صاف کرتے اور سبزی پکاتے یا دال فرائی کرتے یا سلاد اور چٹنی بناتے، یا باہر سے کباب لے کر آتے۔ پھر دسترخوان بچھتا اور بڑے مزے سے باتاں کر کر کے کھانے کا لطف لیتے۔ میرے ہم سبق تصور علی، آس محمد، محمد زبیر، سینئر مولانا اختر حسین، ریاض الدین اور جونیئر محمد دلدار میرے دسترخوان پارٹنرز تھے۔ زبیر اور دلدار اسلام پور کے تھے۔ وہ آپس میں ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے۔ آس محمد اور تصور کشی نگر کے تھے جن کی سرد جنگ الگ جاری رہتی۔ میں اور اختر حسین صاحب بیچ بچاؤ کا کام کرتے اور مزے لیتے، لیکن کبھی کبھی وہ سب مل کر ہم دونوں کی کھینچائی بھی کر دیتے۔ یہ دسترخوان عزیزی ہاسٹل کے روم نمبر ۶۴ میں لگتا۔

اسی کمرے میں ایک دوسرا دسترخوان بھی لگتا جس پر سیتامڑھی کے عنایت اللہ مصباحی اور ازہر القادری وغیرہ کھانا کھاتے۔ ازہر القادری بڑے مزے کا آدمی تھا۔ اگر ہم نے کھانا کھاتے وقت بلایا تو بارک اللہ پڑھتا، دوبارہ بلایا تو بارک اللہ پڑھتا اور اگر غلطی سے سہ بارہ بلالیا تو بلا تاخیر اور بلا تامل آ کر شروع ہو جاتا۔ میں نے کہا کہ اس کا علاج کرنا پڑے گا۔ ایک دن اس نے اپنے دسترخوان پر بلایا، میں تیار بیٹھا تھا۔ بارک اللہ کہا۔ دوبارہ بلایا، بارک اللہ کہا، سہ بارہ بلایا، میں کھڑا ہوا ہی چاہتا تھا کہ اس نے علیٰ طول چوتھی بار بلا لیا۔ میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا کہ اب تو واجب ہو گیا ہے، کھانا ہی پڑے گا۔ کہنے لگا: آپ نے تاخیر کر دی، میں نے چوتھی بار کہہ دیا۔ چوتھی بار کہہ دینے سے منسوخ ہو جاتا ہے۔ میری لاکھ کوشش کے باوجود اس نے مجھے کھانا کھانے نہیں دیا اور یہ دلیل دیتا رہا کہ جب کوئی کھانے کے لیے بلائے تو تیسری بار میں واجب ہو جاتا ہے، لیکن چوتھی بار میں منسوخ بھی ہو جاتا ہے۔

اس وقت مجھے وہ خادم بھی بہت شدت سے یاد آ رہا ہے جو مسجد کی صفائی کے علاوہ مصباحی صاحب کی طرف سے کسی اعلان کے لیے ہاسٹل آ جاتا۔ اس کے مسکراتے ہونٹوں سے ابھرتا ہوا یہ جملہ کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا:

''محترم حضرات! ایک اعلان نوش فرمایئے!''

طلبہ کو مزہ آجاتا، قہقہے اٹھتے، مگر وہ یوں ہی ہنستا کھیلتا، اعلان نوش کراتا گزر جاتا۔ نہ جانے کیوں اسے میرے ساتھ اور مجھے اس کے ساتھ ایک خاص تعلق تھا۔

یہ کہانی ادھوری رہے گی اگر میں جدُّل یا کرکدن کا قصہ نہ لکھوں۔ اسے طلبہ حضاضر اور crocodile بھی کہتے۔ گینڈا کا انسانی روپ، بکھرے بال، کمر میں تہ بند اور اوپر بنیائن پہنے مست ہاتھی کی طرح اشرفیہ اور اس کے اطراف میں ٹہلتا رہتا۔ طلبہ نے اڑا رکھا تھا کہ وہ ناکام عاشق تھا جو اپنی لیلیٰ کی بے وفائی کے بعد دربدری اور خانہ خرابی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ کرکدن کو دو تین عدد نان وتیج اشعار بھی یاد تھے۔ اس کو دیکھتے ہی طلبہ ٹوٹ پڑتے اور ایک ایک دو دو روپیہ دے کر وہی دو شعر اس سے روزانہ سنتے اور پورا مزہ پا جاتے۔ طلبہ جب کھانے سے فارغ ہو جاتے وہ کشکول کی جگہ بڑی سے پتّی لیے ہاسٹل کا چکر لگاتا۔ جس کے پاس جو کچھ بھی بچا ہوتا، چاول، دال، سبزی، سلاد، چٹنی، کباب سب اس کی پتّی میں ڈالتا جاتا۔ وہ بڑی سی پنی بھر کر اسٹیج پر یا کسی اور کنارے جا کر ایک ہی نشست میں سونت دیتا۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھتا، نل کھولتا اور طبیعت سے نہاتا، پھر کسی کونے میں جا کر ڈھیر ہو جاتا۔

ایک دوست نے جدُّل کے ساتھ اس فقیرن کی بھی یاد دلائی، جسے سب 'خوش بنیا' کہتے اور جسے جدُّل کے ساتھ جوڑ کر دیکھتے، جس کا رزق بھی حق تعالیٰ نے طلبۂ اشرفیہ کے پس خوردوں میں رکھا تھا۔ افسوس کہ جاڑے کی ایک رات وہ بے چاری اشرفیہ کے سامنے سڑک کے کنارے ہی ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں چلی گئی تھی۔

کرکدن کی دیکھا دیکھی بعد میں اطراف کے بچے بھی آنے لگے تھے جو طلبہ کے بچے ہوئے کھانے وصول کر کے لے جاتے۔ ان میں ایک بچہ وہ بھی تھا جو طوطا، کوئل، بلی، مور اور مختلف جانوروں اور پرندوں کی آوازیں نکالتا اور اپنی جھولی بھر کر کھانا لے جاتا۔ دس بارہ سال کا اس کا گورا نیارا خوب صورت چہرہ میری آنکھوں میں اب بھی تازہ ہے۔ قدرت نے اسے ایسے گھر میں ڈالا تھا جہاں اسے پیٹ بھرنے کے لیے جانوروں کی بولی بولنا پڑتی، کہیں اور پیدا ہوتا تو شہزادہ ہوتا۔

❁❁❁❁

معمولات

اشرفیہ کی یادیں لکھتے ہوئے خانقاہ مارہرہ کی برکات کا ذکر نہ ہوتو بڑی ناانصافی ہوگی۔ اپنے احساسات وتخمینات کی حدتک ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشرفیہ کی تقریباً ساری نئی بہاریں اسی خانقاہ کے دم قدم سے ہیں۔ حاجی رفیق اسی بارگاہ کے خوشہ چیں ہیں، جو اپنے پیرخانے کے اشارے پر اشرفیہ کی رگوں میں مسلسل تازہ خون فراہم کرتے رہتے ہیں۔ میرے دوران قیام کئی بار ان کا اشرفیہ آنا ہوا۔ اپنی سادگی، شرافت اور تواضع سے انھوں نے سب کا دل جیت لیا۔ ایک تو وضع قطع اور شباہت ایسی ہے کہ اچھے خاصے مولانا، بلکہ پیر نظر آتے ہیں۔ طلبہ کی رپورٹ کے مطابق عرس کی صبح مسجد کی ویرانی پر انھیں بہت افسوس ہوا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اشرفیہ کے ذمہ داران نے اب اس مسئلے پر کافی کنٹرول کرلیا ہے۔ وہ ہاسٹل بھی آ گئے۔ زینوں پر طلبہ کی جانب سے مائل بہ سیاہ سرخ نقاشی دیکھ کر، بہت متعجب ہوئے تھے۔ طہارت خانوں کا جائزہ لیا۔ صفائی کے لیے فوراً ڈول اور مگا اٹھالیا۔ طلبہ یہ منظر دیکھ کر پانی پانی ہوگئے اور قریب تھا کہ مارے شرم کے وہ جیتے جی زمین میں گڑ جاتے۔ بڑی منت سماجت سے حاجی صاحب کے ہاتھ سے ڈول لیا اور از خود صفائی کی۔ امام احمد رضا لائبریری، برکاتی ہاسٹل کا نصف حصہ، عزیزی ہاسٹل کی دوسری منزل کا شمالی اور مغربی حصہ سب ہمارے سامنے تعمیر ہوا۔ ہم سے کچھ دنوں قبل پانی کی بڑی ٹنکی تعمیر ہوئی تھی اور عزیز المساجد میں مسلسل کام جاری تھا۔ طلبہ کا خیال تھا- جونوے فیصد درست ہی ہوگا - کہ تعمیر کا یہ سیل رواں خانقاہ برکاتیہ سے ہی جاری ہوا تھا۔

۲۰۰۱ء کے بعد سے احسن العلماء ڈائننگ ہال شروع ہوگیا تھا۔ احسن العلماء مولانا سید مصطفیٰ حیدر حسن قادری، مارہرہ کے موجودہ سجادہ نشیں امین ملت ڈاکٹر سید محمد امین برکاتی کے والد تھے۔ ڈائننگ حال کا یہ انتساب صرف لفظی نہیں، معنوی بھی ہے۔ ڈائننگ ہال شروع ہوجانے سے کھانے کے تعلق سے جو سابقہ پریشانیاں تھیں وہ سب حل ہوگئیں، یہ الگ بات ہے کہ ان پریشانیوں کے ساتھ جو لطف تھا وہ بھی قصۂ پارینہ بن گیا۔ طلبہ اب ٹھاٹ سے ٹہلتے ہوئے ڈائننگ ہال جاتے، پلیٹ اٹھاتے اور دسترخوان پر براجمان ہوجاتے، جہاں پہلے سے کھانا سجا رکھا ہوتا۔ باری باری سے ہر دن کسی ایک جماعت کو کھانا کھلانا ہوتا۔ جس دن گوشت ہوتا اس دن مسجد سے ڈائننگ ہال کی مسافت بہت کم ہوجاتی۔ حاجی سرفراز کو اللہ سلامت رکھے، جب انھوں نے طلبہ کا یہ ذوق وشوق دیکھا تو شام کے کھانے میں کئی مہینوں تک روزانہ گوشت لازم کردیا۔ لیکن اس کے باوجود ہر جماعت کو شدت سے اپنی باری کا انتظار رہتا۔ چوں کہ روزانہ گوشت تو سب کو مل جاتا، لیکن نلّے صرف کھلانے والوں کے نصیبے میں ہوتے۔ باری والے دیگ سے گوشت نکالتے جاتے اور سارے نلّے الگ محفوظ کرتے جاتے۔ آخر میں جب تمام طلبہ کھا کر جا چکے ہوتے تو باری والے کھانے پر بیٹھتے اور سب کے سب نلّے چوستے، جھاڑتے، پٹختے اور پلیٹ میں ٹن ٹناتے نظر آتے۔ دوپہر کا کھانا عام طور پر سادہ ہوتا اور دال کے ساتھ کسی سبزی یا سالن کا اہتمام نہ ہوتا، اس لیے طلبہ کھانے کے لیے جاتے ہوئے عام طور پر کباب لے کر جاتے۔ ان دنوں کباب فروشوں کی چاندی تھی۔ کچھ سلاد، اچار یا گھی لے کر جاتے۔ سبزیاں پکانے کا رواج تقریباً ختم ہوگیا۔

اب یہاں ہمارے حافظ رافت کی کہانی سنیے۔ جس طرح امریکا کے لیے اپنے شہریوں کی راحت رسانی کے بعد سب سے اہم ایشو دہشت گردی کا خاتمہ ہے، ٹھیک ہمارے حافظ صاحب کے لیے پڑھنے اور پڑھانے کے بعد سب سے اہم ایشو کھانا ہے۔ حافظ صاحب ہر ہفتہ دو ہفتہ پر گوشت پکواتے۔ اس میں شیئر میرا بھی ہوتا۔ لیکن منگانے، پکوانے اور ڈائننگ ہال تک پہنچوانے کی ساری ذمہ داری حافظ صاحب کی ہوتی اور یہ کام وہ اپنے نوخیز شاگردوں سے لیتے جو ان کے زیر درس وتربیت ہوتے۔ آگے آگے کوئی بچہ گوشت کی پتیلی لیے چلتا اور پیچھے پیچھے میں اور حافظ صاحب۔ حافظ صاحب کی طرف سے مجھے تاکید

تھی کہ راستے میں سر اٹھا کر نہیں چلنا ہے، کسی کو سلام نہیں کرنا ہے، کسی سے بات نہیں کرنی ہے، خاص طور پر عارفوا اور سرفرزوا کی طرف دیکھنا نہیں ہے۔'' یہ کھانے کے لیے منہ پھاڑے رہتے ہیں اور صرف آپ کی وجہ سے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ اس لیے میرے ساتھ رہیے تو زیادہ با اخلاق بننے کی کوشش مت کیجیے۔'' بچے کو تاکید ہوتی کہ پتیلی بالکل کنارے کونے میں رکھنا ہے جہاں سے ڈائننگ ہال کا گیٹ بالکل نظر نہ آتا ہو۔ اب ہم تینوں بہت طبیعت سے چانپتے۔ حافظ صاحب کے کھانے کا انداز، اللہ اکبر! جیسے گذشتہ ایک ہفتے سے حالت صوم میں رہے ہوں اور اگلے ایک ہفتے کے لیے پھر اسی سابقہ حالت کی طرف لوٹ جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ حافظ صاحب جب کھا کر فارغ ہوتے تو وہیں پھیل جاتے۔ مجھ جیسا کمزور آدمی بڑی مشکلوں سے انہیں سہارا دے کر اٹھاتا۔ اب اس شان سے ہاسٹل کی طرف روانہ ہوتے، جیسے جنگل کا شیر ہرن کا خون پی کر مست جھومتا ہوا، اپنے کچھار کی طرف چل دیتا ہے۔

ہم لوگ دن کا کھانا کھا کر ظہر کی نماز سے قبل تھوڑی دیر قیلولہ کرتے، پھر ظہر کی نماز ہوتی، بعد ازاں ایک دو کلاسیز ہوتیں۔ فضیلت کے سال ظہر کے بعد مسلم شریف کی گھنٹی تھی۔ حضرت مفتی صاحب فقہی دقائق کی عقدہ کشائی فرماتے ہوئے انتہائی متانت اور وقار کے ساتھ درس دیتے۔ ایک دن آپ نے بیعت وارادت کا مطلب سمجھایا: ''مرید ہونے کا مقصد صرف یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ تک دست بدست اتصال کی برکت حاصل ہو جائے۔ جیسے آپ حدیث پڑھتے ہیں تو اس کی ایک سند ملتی ہے، جو ایک تبرک ہے، اسی طرح بیعت کے ذریعے مشائخ کے شجرے کا تبرک مل جاتا ہے جو ہمیں حضور ﷺ تک پہنچا دیتا ہے۔''

اس وقت یہ شرح پورے طور پر دل میں اتر گئی، مگر یہ واقعہ ہے کہ گزرتے ایام کے ساتھ اس انشراح میں کمی آتی چلی گئی۔

عصر کے بعد کا وقت کھیل اور تفریح کے لیے وقف تھا۔ کرکٹ اور فٹ بال کی دسیوں ٹیمیں تھیں۔ مسجد اور سینٹرل بلڈنگ کے بیچ میں، دار التجوید کے سامنے، عزیز المساجد کے پیچھے کھیتوں میں، ہاسٹل کے صحن اور چھت پر، ہر طرف بچے کھیلتے ہوئے نظر آتے۔ سب سے بڑی ٹیم دار التجوید کے سامنے والے میدان میں کھیلتی۔ اس ٹیم نے کئی بار مبارک پور اور اعظم گڑھ کے کالجز کے طلبہ کے ساتھ کرکٹ کھیلا اور انھیں ناکوں چنے چبوائے۔ میرے ساتھ

غلام مصطفی انعام القادری، علامہ ارشاد نعمانی، ظفر الدین برکاتی، رفعت رضا نوری، صوفی غلام مدثر جیسے بے ذوقے تھے جو کھیل کو ناپسند کرتے تھے، یا کھیل انھیں ناپسند کرتا تھا۔ یہ جماعت طلبۂ اشرفیہ کی اصطلاح میں جمعیۃ القصاریٰ کے نام سے موسوم تھی۔ یہ لوگ عصر کی چائے پی کر تفریح کرتے، یا کسی گوشے میں بیٹھ کر خیالی تاج محل کی تعمیر میں مصروف رہتے۔ بسا اوقات عزیز المساجد کی چھت پر یا کسی اور پرسکون جگہ پر بیٹھ کر کسی نئے موضوع پر گفتگو کر رہے ہوتے، یا کسی نئی کتاب کی اجتماعی قراءت میں مصروف ہوتے۔ فضیلت کے سال مولانا وحید الدین خان کی کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' اسی انداز میں عزیز المساجد کی چھت پر اجتماعی طور پر قسطوں میں پڑھی گئی۔ قاری، ظفر الدین برکاتی ہوتے یا رفعت رضا نوری۔

عصر کے بعد، اور کچھ عصر سے بھی پہلے، قصبہ مبارک پور پہنچتے۔ بڑی ارجینٹی کے اچھے چائے خانوں اور ہوٹلوں میں ٹیلی ویژن لگا ہوتا اور میچ چل رہا ہوتا۔ کرکٹ شائقین زیادہ تر جمال کے ہوٹل کو prefer کرتے۔ گاجر کے حلوے کا آرڈر دیتے اور ٹیلی ویژن میں گھس جاتے۔ بیچ بیچ میں چائے کا دور بھی چلتا رہتا۔ ماسٹر فیاض، اپنی فیض بخشیوں کے لیے کبھی کبھی یہاں بھی پہنچ جاتے۔ پھر کیا تھا، اِدھر چائے گری، اُدھر حلوہ بکھرا، کسی کے پاؤں نالی میں پڑے تو کوئی چپل چھوڑ کر بھاگا۔ یہ امریکی حملے عموماً عصر سے پہلے یا مغرب کے بعد کے مجاہدین پر ہوتے۔ اسی طرح قصبے میں ہونے والے مشاعروں پر بھی اس قسم کا چھاپا پڑ سکتا تھا۔ ان حملوں سے وہ لوگ بہ آسانی بچ نکلتے، جو امریکا کے ساتھ سعودی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے۔

اذان مغرب سے چند منٹ قبل کھیل بند ہو جاتا اور پورا اشرفیہ عزیز المساجد میں سمٹ آتا۔ نماز کے معاً بعد شام کا کھانا ہوتا۔ کھانے کے بعد سے عشا تک طلبہ پڑھنے میں مصروف رہتے۔ اس کے بعد عشا کی نماز ہوتی جس میں پھر ماسٹر فیاض اور مفتی نسیم صاحب کے درشن ہوتے۔ ماسٹر فیاض کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر وہ کسی کو اندھیرے میں بھی دیکھتے تو اس کی چال ڈھال سے اسے پہچان لیتے اور اس کا نام لے کر بلا لیتے۔ دروغ بر گردن راوی، نماز عشا کے وقت برکاتی ہوسٹل پہنچے۔ لائٹ کٹی ہوئی تھی۔ ماسٹر صاحب کو دیکھ کر ایک طالب علم لنگی سے منھ چھپا کر بھاگا۔ ماسٹر صاحب نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ''ابے فلاں! تو ہم سے بھاگتا ہے۔ ہم تمھارا چڈی پہچانتا ہوں۔''

عشا کے وقت مفتی صاحب کا کراٹا بھی خوب چلتا۔عشا کی اذان ہوتی۔ بچے حوض کی طرف نکل جاتے۔بعض نیک بچے وہ بھی ہوتے جو خود ہی ماسٹر صاحب اور مفتی صاحب کی نگرانی کرتے اور ان پر کڑی نظر رکھتے ہوئے ان سے بچ نکلنے کی فراق میں رہتے۔

اشرفیہ کے طلبہ ماسٹر فیاض کے علاوہ کسی اور کے قابو میں آنے والے نہیں تھے۔۲۰۰۱ یا ۲۰۰۲ء میں کسی وجہ سے ماسٹر فیاض معطل کر دیے گئے۔ان کے بعد کئی ایک نئے نگراں بحال ہوئے اور روکر واپس ہوئے۔شاید ۲۰۰۲ء کی بات رہی ہوگی۔پورے اتر پردیش میں منھ نوچوا کی افواہ گرم تھی۔گاؤں اور قصبوں میں لوگ گھر سے باہر سونے میں ڈرنے لگے تھے۔ افواہ یہ تھی کہ رات میں کوئی بندر نما جانور یا روبوٹ آتا ہے اور لوگوں کے منھ نوچ کر کے بھاگ جاتا ہے۔لوگ اسے منہ نوچوا کہتے۔اخبارات میں بھی اس کی خبریں شائع ہونے لگی تھیں۔ طلبۂ اشرفیہ نے اس لفظ کو نگراں کے حق میں بطور استعارہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔جب بھی نگراں صاحب ہاسٹل میں قدم رکھتے، چاروں طرف سے شور ہوتا: بھاگو! منھ نوچوا آ گیا۔ایک دن نگراں صاحب گیٹ سے گزرتے ہوئے یہ دیکھ کر فق پڑ گئے کہ دیوار پر ایک بڑی سی تصویر بنی ہوئی ہے اور اس کے نیچے نگراں کا نام مع عرف ''منھ نوچوا'' لکھا ہوا ہے۔بقول راوی نگراں صاحب یہ دیکھ کر رو پڑے اور اشرفیہ والوں سے اجازت لے لی۔اشرفیہ کے ارباب حل وعقد کو مجبور ہو کر پھر ماسٹر فیاض کو بلانا پڑا، چوں کہ یہ روگ انھیں کے بس کا تھا۔

عشا کے بعد سے ۱۱ بجے تک طلبہ پڑھنے میں مصروف رہتے۔۱۱ بجے سے پانچ منٹ قبل بطور وارننگ لائٹ بجھ کر پھر آن ہو جاتی۔ٹھیک گیارہ بجے جنریٹر بند ہو جاتا اور اسی فیصد اشرفیہ سو جاتا۔دس فیصد وہ ہوتے جو لالٹین جلا کر پڑھتے اور دس فیصد آشفتگان کوئے بتاں اپنے اشغال میں مصروف ہوتے۔کبھی دو دو تین تین بجے رات کے سناٹے میں شور اٹھتا، فلک شگاف نعرے لگتے۔ یہ در اصل ہندو پاک میچ کے اختتام کا لمحہ ہوتا اور فاتح گروپ جشن منا رہا ہوتا۔

❁❁❁❁

بہار ادب

۲۰۰۰ء تک جامعہ اشرفیہ کے طلبہ میں صرف خطابت کا خروش تھا۔ جماعتی، صوبائی اور ضلعی سطح کی بے شمار تقریری انجمنیں قائم تھیں۔ ۲۰۰۱ء کو اس اعتبار سے اشرفیہ کی تاریخ کا نقطۂ انقلاب کہا جا سکتا ہے کہ اس سال ''بہار ادب'' کے نام سے پہلی تحریری انجمن قائم ہوئی۔ اس کا قصہ کچھ یوں ہوا:

جناب عارف اقبال اپنے جسم اور زبان کی طولانی کے سبب محتاجِ تعارف نہ تھے۔ اس سال انھوں نے ایک دوسرے طالب علم سے میرا تعارف کرایا، جو پرانے ہوتے ہوئے بھی، میرے لیے نئے تھے۔ چھوٹا قد، گھنی داڑھی، موٹا چشمہ، منحنی آواز، خاموش ایسے کہ بولنے سے گھبرائیں اور جن سے دل ملے اور ان سے بولیں تو پھر اتنا بولیں کہ لوگ سننے سے گھبرائیں۔

یہ مولانا غلام مصطفی انعام القادری ہیں۔ جو آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مولانا عارف اقبال نے تعارف کرایا۔

مولانا گویا ہوئے اور تحریر و قلم کی اہمیت و ضرورت پر اور اس کی حساسیت اور اہل سنت کی اس کے حوالے سے بے حسی پر ایک لمبی فلسفیانہ تقریر سنا ڈالی۔ قصہ مختصر! طلبۂ جماعت کی میٹنگ طلب کی گئی اور ایک تحریری انجمن کا تشکیلی خاکہ پیش کیا گیا۔ طلبہ کو اختیار تھا کہ ان میں سے جو چاہیں اس انجمن کا حصہ بنیں اور جو چاہیں غیر متعلق رہیں۔ طلبۂ جماعت نے اس کا خیر مقدم کیا اور تقریباً ان میں سے نصف نے اس انجمن کی رکنیت قبول کر لی۔

کام شروع ہوا۔ عنوان منتخب کیا جاتا اور اس کے تحت لکھنے کے لیے طلبۂ جماعت کو مدعو کیا جاتا۔ ان کی سہولت کے لیے عنوان مقالہ کے عناصر بھی لکھ دیے جاتے اور مقالہ لکھنے کے لیے انہیں پندرہ سے بیس دن کا موقع دیا جاتا۔ یہ مقالہ جمع ہوتا اور اس کے ساتھ ہی اگلے مقالے کے عنوان کا اعلان حسب سابق کر دیا جاتا۔ ادھر جمع شدہ مقالات چیک کرنے کے لیے اساتذہ کے سپرد کر دیے جاتے۔ اس سیاق میں ۲۰۰۱ء میں بحال ہونے والے نئے اساتذہ ہمارے لیے زیادہ معاون ثابت ہوئے۔ وہ مقالات کی ضروری اصلاح کر کے ہر ایک پر نمبر بٹھا دیتے۔ پھر دیوار پر نتیجۂ مقالات آویزاں کر دیا جاتا۔ زیادہ نمبر حاصل کرنے میں طلبہ اوپر نیچے ہوتے رہتے۔ ویسے زیادہ تر صوفی غلام مدثر ہی بازی مارتے۔ مقالات کے موضوعات سماجی اور سیاسی بھی ہوتے اور دینی و ادبی بھی۔ احباب بہت شوق سے پیش پیش رہتے۔ بہار ادب کی طرف سے دو فکر ساز جدار یے؛ ''شاہین'' (اردو) اور ''الربیع'' (عربی) بھی شائع ہوتے۔

بعض منچلے ہماری کھلیاں اڑانا چاہتے تھے، یہ اور بات ہے کہ ان کی طرف سے اڑائی جانے والی کھلیاں اڑتی نہ تھیں۔ لیکن اُس سال کے ششماہی امتحان کے نتیجے نے انہیں اس کا زریں موقع فراہم کر دیا۔ ہمارے جتنے احباب بہار ادب میں سرگرم تھے، سب کے نتائج بری طرح خراب رہے۔ یہ حادثہ میرے لیے تو حوصلہ شکن نہیں تھا، تاہم اس نے بہت سے احباب کے دل میں گناہ بے گناہی کا احساس ضرور پیدا کر دیا۔ چوں کہ عام طلبہ کے تبصرے تھے بھی بہت ہتک آمیز اور اعصاب شکن۔ ہم نے احباب کی ڈھارس بندھانے کوشش کی اور انھیں یقین دلایا کہ اس واقعے کو دل پر نہ لیں۔ ایسا اتفاقی بھی ہوسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آئندہ ہمیں اس پر بھی خاص توجہ دینی چاہیے، تاکہ اعداے لوح وقلم خیر منائیں، شر نہ کریں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اگر تحریری سرگرمیوں کے سبب ہی رزلٹ خراب ہوا ہے تو بھی ہمیں صرف اس نقصان کو نہیں دیکھنا چاہیے، تحریری سرگرمیاں محض بیکار نہیں گئی ہیں، ان سرگرمیوں نے بھی ہمیں بہت کچھ دیا بھی ہے، جس کا صحیح ادراک ہمیں آئندہ اپنی زندگی میں ہوگا۔

احباب کا حوصلہ کسی قدر بحال ہوا اور پھر ناقہ سوئے منزل چل پڑی۔ اگلے سال ۲۰۰۲ء میں جب ہم سالانہ چھٹی کے بعد دوبارہ جامعہ حاضر ہوئے تو خامسہ کے سالانہ نتیجے

نے نتیجۂ ششماہی سے پیدا شدہ غم کو یکسر غلط کر دیا۔ تحریری سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں کا سالانہ رزلٹ امید سے زیادہ بہتر تھا۔ ہمارے حوصلے بلند ہو گئے تھے، اس لیے ہم نے پورے جامعہ میں قلم کی حکمرانی کی منصوبہ بندی کی۔ بہار ادب کی میٹنگ میں یہ طے پایا کہ ہمارا مشن اس وقت تک ناکام رہے گا جب تک ہم اپنی اس تحریک کو اپنی جماعت سے نکال کر پورے جامعہ میں عام نہیں کر دیتے۔ یہ بات بھی آئی کہ سابعہ اور فضیلت کے طلبہ ہمارے اکابر میں ہیں اور ان کا یہ احساس کبھی بھی ہماری تجویز کو لائق اعتنا نہ سمجھے گا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اس تحریک کو نیچے کی تمام جماعتوں میں رائج کر دیا جائے۔ ہر جماعت کی الگ الگ ناموں سے تحریری انجمن بنے۔ اس کے ساتھ مختلف جماعتوں کے فعال طلبہ پر مشتمل ایک مشترکہ کمیٹی بنے جو تمام جماعتوں کی سرگرمیوں کو واچ کرے۔ ایک بات یہ بھی آئی کہ جماعت اعدادیہ واولیٰ کے طلبہ کے پاس نہ وقت ہوتا ہے اور نہ اس بات کا انہیں شعور ہوتا ہے کہ وہ خود سے مقالے کا عنوان متعین کریں اور اس پر چند سطریں لکھیں۔ اس لیے ان دونوں جماعتوں کی تمام تر ذمہ داریاں مشترکہ کمیٹی کے سر ڈال دی گئیں۔ مشترکہ کمیٹی کے صدر حافظ رافت اور سکریٹری ساجد ناگوری تھے۔ نائب صدر ساجد رضا جماعت خامسہ کشن گنج اور خزانچی عاشق کشمیری جماعت خامسہ تھے۔ پورے جامعہ میں بہت زور وشور سے تحریری بیداری آئی اور ہر جماعت میں مقالات لکھنے لکھانے کا سلسلہ چل پڑا۔ قلم کی اس حکمرانی سے صرف دو جماعتیں- سابعہ اور فضیلت- مستثنیٰ تھیں اور ان کی طرف سے گاہے بگاہے طنز وتعریض کے تیر ونشتر بھی ہم پر برستے رہتے۔ مثلاً یہ کہ ''مشترکہ کمیٹی'' کو ''محترمہ کمیٹی'' سے موسوم کر دیا گیا۔

مشترکہ کمیٹی کے صدر حافظ رافت صاحب، جو تربیت اطفال میں طاق واقع ہوئے ہیں، نے اعدادیہ اور اولیٰ کے طلبہ میں تحریری شعور پیدا کرنے کے حوالے سے نمایاں کام انجام دیا۔ ان بے چاروں کو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ مضمون کیا ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے اور کیسے لکھا جاتا ہے؟ حافظ صاحب ان طلبہ کو خصوصی وقت دیتے۔ ہمارا مدرسہ، ہمارا گاؤں، والدین کا احترام اور اس قسم کے آسان عنوانات ان کے لیے مقرر فرماتے، پھر انھیں بلا کر اس عنوان کا مطلب سمجھاتے، اس پر کیا لکھنا ہوگا اور کیسے لکھنا ہوگا، شروع کیسے کرنا ہے اور ختم کیسے کرنا ہے،

یہ سب کچھ بتاتے۔ معاون کے طور پر انھیں کوئی کتاب یا مضمون بھی دیتے۔ پھر لکھنے کے لیے مشترکہ کمیٹی کی طرف سے کاغذ بھی فراہم کرتے۔ ان الطاف وعنایات کا اثر یہ تھا کہ، گو کہ حافظ صاحب نے جماعتی عنوانات پر خود کبھی کوئی مقالہ نہیں لکھا، لیکن مقالہ نگاری سیکھنے والوں کا ہر وقت ان کے کمرے میں تانتا لگا رہتا، حتیٰ کہ حافظ صاحب کے بعض گستاخوں نے انہیں 'ماہر اطفال' کا خطاب دے رکھا تھا۔

مشترکہ کمیٹی تمام جماعتوں کی تحریری سرگرمیوں کی نگرانی کے علاوہ جامعہ کی دیگر خدمات بھی اپنے سر لے رکھی تھی۔ مثلاً ڈائننگ ہال میں کھانے کے وقت بچوں کو پانی پلانا، کھانے کی تقسیم میں مدد کرنا، شر پسندی اور افراتفری کو روکنا اور سب سے آخر میں کھانا کھانا، وغیرہ۔

۲۰۰۳ء یعنی سابعہ کے سال ہماری جماعت کے بعض احباب محمد سرفراز، عارف اقبال اور جاوید اختر وغیرہ نے مختلف جماعتوں کے اپنے خاص احباب کو لے کر ''جہاں نما'' کے نام سے ایک نئی صحافتی و ادبی تنظیم کی بنا رکھی، جس کی صحافتی، شعری اور ادبی سرگرمیاں بہت جلد جہانِ اشرفیہ پر چھا گئیں۔

اس تنظیم کی جانب سے ''جہاں نما'' نام سے ہفتہ وار اردو جداریہ شروع کیا گیا جس نے اپنے پر لطف مضامین، خبروں، تبصروں اور لطیفوں کے سبب مقبولیت کے معاملے میں دیگر تمام جداریوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس میں کسی دھڑکن چمپارنی کا مزاحیہ کالم بھی شائع ہوتا تھا، جن کی ہفوات نگاری سے ذیشان مصباحی کل بھی بری تھا اور آج بھی بری ہے۔ پنج شنبہ کو رات بھر یہ جداریہ لکھا جاتا اور جمعہ کو علی الصباح دیوار پر آویزاں کر دیا جاتا۔ فجر بعد سے قارئین کا تانتا لگا رہتا۔

''جہاں نما'' کے ساتھ پندرہ روزہ ادبی ضمیمہ ''رہ نما''، ہندی جداریہ ''کرانتی'' اور انگلش جداریہ ''Herald'' بھی شائع ہوتا۔ یہ تمام جداریے اشرفیہ کے طلبہ میں بہت مقبول رہے، اگرچہ اشرفیہ کی تاریخ میں اردو جداریہ کی شروعات ''شاہین'' سے ہوتی ہے اور جو فکری اور نظری مضامین شاہین میں چھپتے، وہ صرف اسی کے ساتھ مختص تھے۔ عربی اور انگلش جداریے اس سے قبل بھی نکلتے رہے، غالباً ان کا آغاز مولانا مقبول مصباحی کے زمانے میں ہوا تھا، جو میرے اشرفیہ پہنچنے سے قبل ہی اسے الوداع کہہ گئے تھے۔

جہاں نما نے مشاعرے کا بھی آغاز کیا جس میں بے شمار طلبۂ اشرفیہ طبع آزمائی کرتے۔ پہلا مشاعرہ روم نمبر ۵۵ میں ہوا، جسے جگہ تنگ پڑنے کے سبب عزیزی ہاسٹل کے صحن میں لایا گیا۔ دوسرا ڈائننگ ہال میں ہوا جس میں فیصل کی حیثیت سے مولانا کلیم مصباحی اور مبارک پور کے معروف شاعر زیست یار فیصل تھے، جب کہ مہمان خصوصی اور خطیب خصوصی کے طور پر مبارک پور انٹر کالج کے ذی علم استاذ جناب محمد فیض تھے، جنھوں نے ''اردو میں حقیقت نگاری'' کے عنوان سے گفتگو کی تھی۔ ان کی باتیں تو مجھے یاد نہیں رہیں، البتہ یہ عنوان ہمیشہ میرے ذہن سے چسپاں رہا اور دماغ کی باریک شریانوں میں روشنی بکھیرتا رہا۔ خصوصاً شعروشاعری کے حوالے سے اپنے تمام تر ضعف حافظہ کے باوجود زیست یار فیصل کا یہ بامعنی شعر اب تک بھلا نہ سکا:

گل ادب کو کترتا ہے بس وہی ظالم
جو دیکھنے میں مکمل ادیب لگتا ہے

جہاں نما کا تیسرا مشاعرہ فضیلت کے سال ۲۰۰۴ء میں اشرفیہ کے مرکزی اسٹیج پر بہت اہتمام سے ہوا، جس میں نظامت کے فرائض انجام دینے کے لیے جناب آصف رضا سیفی کو بلایا گیا تھا، جب کہ مولانا عبید اللہ خان اعظمی خطیب خصوصی کی حیثیت سے جلوہ افروز تھے۔ اس مشاعرے نے اپنی جلو میں اشرفیہ کے طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ مبارک پور کے عوام کی بھی ایک بڑی تعداد کو جمع کر لیا تھا۔

اسی دور میں ادبی ذوق کے حامل بعض اچھے طلبہ نے- جن میں جناب شبیر احمد شاداب اور کاشف رضا شاد پیش پیش تھے- ''آئینۂ خوش رنگ'' کے نام سے ایک الگ ادبی انجمن قائم کی۔ اس کی طرف سے بھی ''آئینہ'' نام کا اردو جدار یہ شائع ہوتا۔ شبیر شاداب اور کاشف رضا شاد میں تخلیقیت تھی، جس کا ثبوت ان کی منفرد کوششیں اور تحریریں تھیں۔ افسوس کہ بعد میں اس کا کما حقہ اظہار نہیں ہو سکا۔

۲۰۰۳ء کے شروع میں اشرفیہ میں عمومی تحریری بیداری لانے کے اعتراف میں ''آئینۂ خوش رنگ'' کی طرف سے راقم السطور اور جناب غلام مصطفی انعام القادری (ازہری) کو بالترتیب ''حافظ ملت ایوارڈ'' اور علامہ ارشد القادری ایوارڈ'' کے نام سے

اعزازی شیلڈز پیش کی گئیں، جو دراصل ہمارے احباب کی کاوشوں کا اعتراف تھا۔(۱)

''جہاں نما'' اور'' آئینۂ خوش رنگ'' کے بعد انہی سے ملتی جلتی اور کسی قدر مختلف تنظیم ''پیغام اسلام'' کے نام سے معرض وجود میں آئی۔ پیغام اسلام کے روح رواں کولکاتا کے جناب امتیاز بھائی تھے۔ اس شخص کے اندر تعلیمی کم تخلیقی اور تنظیمی صلاحیتیں زیادہ تھیں۔ میں نے کئی بار انہیں تعلیم کی اہمیت سمجھانا چاہی، لیکن ہر بار انہوں نے مجھے تنظیم کی اہمیت سمجھا دی۔ پیغام اسلام کے بینر تلے طلبہ میں مختلف مسابقے انعقاد پذیر ہوئے اور الگ نوعیت کی محافل قائم ہوئیں۔ اس تنظیم نے طلبہ کے اندر مخفی دینی، علمی، اصلاحی اور مسابقاتی جواہر نکھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے تحت ''قادیانی مذہب'' اور اس قسم کی دیگر اہم کتابیں بھی ازسرنو شائع ہوئیں۔ خبروں کے مطابق اس کا سلسلہ امتیاز بھائی کی فراغت کے بعد بھی اشرفیہ میں جاری رہا اور انہوں نے بھی کولکاتا پہنچ کر اپنی امتیازی کوششیں جاری رکھیں۔ مختلف موضوعات پر سیمینارز اور خطابات کرائے۔ ان کے ایک پروگرام میں راقم بھی کولکاتا جا چکا ہے۔

افسوس ۲۰۰۴ء میں بہار ادب کے ''با'' کو بعض کرم فرماؤں نے مکسور کر دیا۔ جی چاہتا ہے کہ اس کی بعض کھٹی میٹھی یادیں بھی قلم بند کر دوں۔

❁❁❁❁

---

(۱) جب فیس بک پر یہ تحریر شائع ہوئی تو مولانا شبیر شاداب مصباحی نے معلومات میں یہ اضافہ فرمایا: ''اس ایوارڈ کے لیے انتخاب کے مرحلے میں یہ چوک ہوگئی کہ ایوارڈ کے حقدار چننے کے لیے ممبران آئینہ خوش رنگ کا استثنا نہیں کیا گیا، اس غلطی کی وجہ سے طلبۂ اشرفیہ نے جن دو ناموں کو سب سے زیادہ ووٹ کیا اس میں ایک آئینہ خوش رنگ کا ممبر بھی تھا، اس لیے گوشۂ گمنامی میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ اس کے بعد جس کو سب سے زیادہ ووٹ ملا ہے اسے ایوارڈ دیا جائے جس کے حقدار مولانا غلام مصطفیٰ انعام قادری صاحب ہوئے اور اس بات کو شاد و شاداب نے اپنے پیٹ میں دفن کر لیا۔'' میرا وجدان کہتا ہے کہ آئینۂ خوش رنگ کے وہ سعادت مند ممبر خود جناب شاد مصباحی تھے۔

گیارہواں منظر

فلاپ شو

''قوم جاگ رہی ہے!''

یہ ۲۰۰۴ء میں اشرفیہ کے سامنے ہونے والے ایک جلسے کی رپورٹ کا عنوان ہے، جسے خوشتر صاحب نے جام نور میں شائع کیا تھا۔ پھر یہ جملہ طلبۂ اشرفیہ میں ضرب المثل بن گیا۔ جب بھی کوئی کسی کو شرارت کرتا دیکھتا، فوراً یہ جملہ اس پر چپکا دیتا۔ ابے سدھر جا! قوم جاگ رہی ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ آخر کیا پس منظر ہے اس جملے کا، تو سنیے:

ماہ نامہ جام نور کے فروری ۲۰۰۳ء کے شمارے میں پوربی زبان وتہذیب کے عبقری شاعر بیکل اتساہی کا انٹرویو چھپا۔ اس میں حافظ ملت کے بعد پیدا ہونے والے دو گروہوں میں سے مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب کا شمار اس گروہ میں ہو گیا تھا جو اشرفیہ کے حالیہ سربراہ اعلیٰ مولانا عبدالحفیظ صاحب کے مخالف تھا۔

یہ بات خلاف واقعہ تھی، جس پر مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب کا ناراض ہونا فطری تھا۔ جب یہ بات بیکل صاحب تک پہنچی تو وہ خود بھی شرمندہ ہوئے اور ایک خبر کے مطابق وہ بلینک پیپر پر سائن کرنے کے لیے تیار ہو گئے، جس پر مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب کو اجازت تھی کہ اپنے حسب منشا معذرت نامہ لکھ دیں، لیکن مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب یہ کہہ کر ٹال گئے کہ اس کی حاجت نہیں۔

اس کے باوجود بیکل صاحب کی طرف سے جام نور کے اپریل کے شمارے میں معذرت کے عنوان سے یہ وضاحت چھپی:

''ماہنامہ ''جام نور'' شمارہ فروری ۲۰۰۳ء صفحہ ۲۶ تا ۳۱ صفحہ پر رسالہ کے ایڈیٹر خوشتر نورانی میاں کے ذریعہ مجھ سے لیا ہوا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو میں محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری صاحب جانشین صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے متعلق کچھ ایسی باتیں طبع ہوگئی ہیں جو قطعاً غلط اور بے بنیاد ہیں۔ مجھے یہ خبر حضور عزیز ملت دامت برکاتہم القدسیہ کے خط سے ملی۔ میں نے فوراً اس کی تصحیح کے لئے خط لکھ دیا کہ اس کی تردید کردی جائے۔ معلوم ہوا کہ نورانی میاں موجود نہیں ہیں، لہٰذا بروقت اس کی تصحیح نہیں ہو پائی۔ میں نے اس انٹرویو میں صرف حضور حافظ ملت کی کفش برداری میں ۱۹۵۷ء سے جو حالات رونما ہوئے ہیں اس کو بیان کیا ہے۔ اگر کسی بزرگ کی شان میں کوئی جملہ یا کوئی لفظ غلط چھپ گیا ہے تو میں ندامت کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔ اور سب سے معافی مانگتا ہوں۔ مجھے انہیں کی آغوش میں پلنا ہے اور رہنا ہے۔ میں اپنے ان بزرگوں کی گستاخی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

میں نے انٹرویو میں حامیان حافظ ملت کا ذکر کرتے ہوئے بار بار محدث کبیر کا نام لیا، سوئے اتفاق کہ مخالفین میں نام چھپ گیا۔ جو غلط اور بالکل غلط ہے۔ مجھے اس کا بیحد افسوس اور قلق ہے۔ اور اس کی وجہ سے میں ذہنی تناؤ کا شکار ہوں۔

ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ میں اپنے دادا پیر کے شہزادے کی شان میں کوئی گستاخی کروں۔ ان کی دل آزاری کروں۔ کفش بردار حضور حافظ ملت، بیکل اتساہی بلرام پور''

لیکن اس کے باوجود مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب کے مدرسے کے استاذ مفتی ابوالحسن کے قلم سے آناً فاناً ایک کتاب معرض وجود میں آ گئی۔ عنوان تھا: ''بیکل بے عقل کے انٹرویو کا تنقیدی جائزہ''۔ لفافے سے ہی آپ مضمون خط کا اندازہ کرلیں۔ اس کے بعد سے ہی مبارک پور سے گھوسی کی مسافت دن بہ دن بڑھنے لگی تھی۔ تاہم اس مسافت کو عبور کرتے ہوئے مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب، جو اس وقت اشرفیہ کے شیخ الحدیث تھے، مسلسل اشرفیہ آتے رہے۔ اس کشمکش میں پورا سال گزر گیا۔ اواخر جولائی ۲۰۰۳ء میں حافظ ملت کا عرس تھا۔ اب وہ زخم کچھ بھرنے کو تھا کہ عین عرس کے دن ایک پوسٹر نگاہوں کے سامنے آیا۔ عنوان تھا: ''عبید اللہ اعظمی

کفر کی دہلیز پر''۔ یہ کتاب المجہول الی المجہول تھی، لیکن اس کا ذمہ دار مولانا ضیاء المصطفیٰ کے ہم نواؤں کو سمجھا گیا۔ مولانا عبید اللہ خان اعظمی اسے دیکھ کر آگ بگولہ ہو اٹھے اور پھر وہ جارح تقریر کی جس کے بعد مولانا ضیاء المصطفیٰ اسی صبح ہمیشہ کے لیے اشرفیہ کو خیر باد کہہ چلے۔

اشرفیہ کے مین گیٹ پر ایک پوری فروش ہوا کرتا تھا، شمشاد پوری والا۔ پتہ نہیں اس کی دکان اب بھی ہے یا نہیں۔ ہمارے زمانے میں اس کی پوری بڑی لذیذ ہوا کرتی تھی۔ کھانے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ اس کے بازو میں پھر شمیم نے بھی اپنی دکان کھول لی جس کے بعد مقابلہ کچھ تیز ہوا۔ ٹوٹی کرسیوں اور ٹیڑھی میزوں پر مشتمل یہ دکانیں اشرفیہ کے طلبہ کے لیے صرف لذت کام و دہن کا مرکز نہیں، مجلس اقوام متحدہ کا اوپن ایوان بھی ہوتیں، جہاں دین و دنیا کے ہر قسم کے مسائل discuss ہو سکتے تھے۔

شمشاد پوری والا، مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب کا شیدائی تھا۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا، اسے اس کا شدید قلق تھا۔ اگلے سال جب جامعہ کھلا، شمشاد نے برکاتی ہاسٹل کے ٹھیک سامنے سڑک کی دوسری جانب ایک جلسے کا پروگرام رکھا، یا اس سے رکھوایا گیا۔ اس جلسے میں مہمان خصوصی کے طور پر مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب تھے، جب کہ زینت جلسہ کے طور پر مفتی اختر رضا خان ازہری بریلوی کا نام اس جلسے کی کامیابی کی ضمانت تھا۔ خطیب خصوصی مولانا غلام رسول بلیاوی تھے۔ حسن اتفاق کہ یہ تمام معروف شخصیات جلوہ افروز بھی ہوئیں۔ جب ارباب اشرفیہ کو پتہ چلا کہ عصر کے وقت مفتی اختر رضا خاں ازہری بارگاہ حافظ ملت میں فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لائیں گے تو اشرفیہ کا سارا اسٹاف وقت مقررہ پر اشرفیہ کے مین گیٹ پر حاضر ہو گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ حضرت کا استقبال ہو گا، پھر ان کے ساتھ چائے وائے ہو گی، پھر حضرت اپنی قیام گاہ کی طرف چلے جائیں گے۔ حضرت اپنے وقت پر تشریف لائے۔ اشرفیہ کے اساتذہ سامنے پھول لیے کھڑے تھے۔ لیکن ڈرائیور کو اتنی کڑی Instruction تھی کہ اس نے گاڑی نہیں روکی، حتیٰ کہ اساتذہ کو ہی تیزی سے سامنے سے ہٹنا پڑا۔ ازہری صاحب کی گاڑی سیدھے مزار حافظ ملت پر پہنچی۔ وہاں انہوں نے فاتحہ پڑھی اور پھر واپس ہو گئے۔

جلسہ گاہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ازہری میاں کے شیدائی، مولانا ضیاء المصطفیٰ کے عشاق، مولانا بلیاوی کے دیوانے اور اشرفیہ کے حلیفوں اور حریفوں کے ساتھ طلبۂ اشرفیہ بھی

بڑی تعداد میں حاضر تھے۔ تمہیدی نعتوں اور تقریروں کے بعد مولانا بلیاوی کو دعوت سخن دی گئی۔ ابھی ازہری صاحب اور مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب اسٹیج پر نہیں آئے تھے۔ ۱۲ بجے کے آس پاس کا وقت رہا ہوگا۔ مولانا بلیاوی نے تقریر شروع کی:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ شروع کہاں سے کروں؟ ہزاری باغ سے شروع کروں یا کلکتہ سے، اعظم گڑھ سے شروع کروں یا پارلیامینٹ سے۔۔۔ مجھ سے نہ الجھنا۔ میں ہرا لیموں اور لال لیموں سب نچوڑ دوں گا۔''

مولانا اعظمی پر بم بارڈنگ ہوتی رہی۔ پھر اشرفیہ کی باری آئی:

''ادارہ شخصیت سے ہوتا ہے۔ اگر شخصیت نہ ہو تو بڑی عمارتوں سے ادارہ نہیں بنتا۔ شخصیت کے بغیر بڑی عمارتیں اصطبل سے بھی بدتر ہیں۔''

دل نے کہا: ''یا تو اتنی جرات ہو کہ آدمی ایسی ہرزہ سرائیوں پر سوال اٹھائے، یا پھر مجلس سے خود اٹھ جائے۔ بیٹھ کر اپنے سامنے اس قسم کی باتیں سننا بے غیرتی ہے۔'' میں محفل سے نکل کر چل دیا۔ لیکن ابھی اشرفیہ کے گیٹ کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ جلسہ گاہ سے شور اٹھتا ہوا سنائی دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سب سے پہلی آواز ہمارے دوست مجیب بھائی نے اٹھائی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہر چہار جانب سے آواز آنے لگی: ''مارو، مارو، مارو سارکو۔''

جب بلیاوی صاحب نے دیکھا کہ اچانک فضا ابر آلود ہوگئی اور اب بارش ہوا چاہتی ہے تو فوراً پینترا بدلا: ''آپ حضرات ایک طرف ہو جائیں۔ حضور تاج الشریعہ آرہے ہیں۔ انہیں راستہ دیں۔''

''اب تاج السریعہ آئیں یا کوئی آئیں۔ تو کے بینکھوں جرور۔''

کسی مبارک پوری کی آواز بلند ہوئی۔ آناً فاناً چند نوجوان اسٹیج پر پہنچ گئے۔ اس میں کچھ بچانے والے تھے تو کچھ برسانے والے۔ بلیاوی صاحب فوراً بیٹھے اور جبہ اتار کر باہر نکلے۔ تبھی میری جماعت کے ایک مسٹنڈے جوان محسن گجراتی نے، جو مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب کے خیر خواہوں میں تھا، بلیاوی صاحب کو اپنے بازوؤں میں دبوچا اور دوڑ لگا دی اور پلک جھپکتے ہی جلسہ گاہ سے باہر نکل آیا، سڑک عبور کی اور اشرفیہ کی چہار دیواری کو پھلانگتے ہوئے برکاتی ہاسٹل میں پہنچا دیا۔ ایک روم میں انہیں بٹھایا اور روم کو بند کر دیا۔ اس جوان کو

میں مبارک باد دیتا ہوں کہ اس نے جسم و دماغ، دونوں کا ایک ساتھ بروقت استعمال کیا، جس کی وجہ سے ایک بڑا سانحہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ جب اس حقیقت کا ادراک اشرفیہ کے شیدائی مبارک پوریوں کو ہوا تو وہ بھی دیوار پھلانگ کر اور کچھ مین گیٹ سے اشرفیہ میں داخل ہو گئے اور ہاسٹل میں گھسنے اور اشرفیہ کے بچوں سے الجھنے کی کوشش کی۔ ایسے وقت میں اشرفیہ کے طلبہ نے دو چار مبارک پوریوں کو طبیعت سے رسید کیا۔ ہمارے صمدانی بھائی نے ایک بانس کا پھٹا اٹھا کر جب ایک مبارک پوری پر برسایا تو کوئی ایک مبارک پوری لنگی اٹھا کر بھاگے۔

''بھاگ رے۔ یہ تالبیلیّن سار ہمارا ہی کھات ہیں اور ہمیں کو ہینکت ہیں۔''

ادھر مین گیٹ پر اشرفیہ کے اساتذہ اور ذمہ داران کھڑے ہو گئے اور ہجوم کو کنٹرول کرنے لگے۔ اس وقت ہمیں مولانا نعیم الدین صاحب کی قیادت کا جوہر نظر آیا۔ مولانا نعیم صاحب نے بروقت مورچہ سنبھالا اور مبارک پوریوں کو کنٹرول کیا۔ انہیں بتایا کہ اگر بلیاوی کے ساتھ کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو اشرفیہ کی بڑی بدنامی ہوگی۔ کیا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ اشرفیہ بند ہو جائے یا کسی کی نظر بد کا شکار ہو جائے۔ آپ لوگ جائیں۔ ہم مولانا سے اس معاملے پر بات کریں گے۔

ٹھیک اسی وقت مولانا نعیم صاحب کے ایک قریبی اسٹاف جوش جنوں میں یہ کہنے لگے کہ مار دو، جو ہوگا دیکھ لیا جائے گا۔ لیکن نعیم صاحب پورے ہوش و حواس میں تھے۔ فوراً انہیں ٹوکا: ''آپ کا دماغ خراب ہے؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں، کچھ سمجھ رہے ہیں آپ؟''

خیر! خدا خدا کر کے معاملہ کنٹرول ہوا۔ مولانا نعیم صاحب اور دیگر اساتذہ نے سختی کے ساتھ طلبۂ اشرفیہ کو ہاسٹل کے اندر کیا۔ مبارک پوری جو بار بار بھڑک رہے تھے، انہیں اشرفیہ کی چہار دیواری سے باہر نکالا۔ پھر کچھ ہی دیر میں پولس بھی آ گئی اور معاملہ پورے طور پر کنٹرول میں آ گیا۔

رات کے کسی حصے میں مولانا بلیاوی کو روانہ کر دیا گیا اور اس طرح یہ فلاپ شو اختتام پذیر ہوا۔ سنا گیا کہ اس کے بعد جب گھوسی میں صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی کے عرس میں بلیاوی صاحب پہنچے تو ''قائد سرفروشاں'' کے خطاب سے پکارے گئے۔

۞۞۞۞

مجلس قضا

مسند قضا پر حضرت مفتی صاحب جلوہ افروز تھے۔ ان کی بائیں طرف مفتی نسیم صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے تپائی کے ایک کنارے پر قمر بھائی اور دوسرے پر ساجد ناگوری۔ میں بہ انداز مجرمانہ بیچ میں بیٹھا۔

''حضور! انہوں نے فلاں دن جامعہ کے گیٹ پر ہمیں گالی دی تھی۔''

غالباً انھوں نے گالی کی نشان دہی بھی کی تھی۔ ''میں نے؟'' میں بھونچکا تھا۔

''جی آپ نے! اس دن جو آپ لوگ قصبے سے آرہے تھے اور میں جارہا تھا؟''

''نہیں جناب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ کو گالی کیوں دوں گا۔ میں نے ہنستے ہوئے یونہی خیر خبر کی باتیں کی تھیں۔ غالباً آواز آپ تک صاف نہیں پہنچی اور آپ بدگمان ہوگئے۔''

''نہیں، آپ نے گالی دی تھی!''

''نہیں جناب! میں گالی کیوں دوں گا؟ میں نے گالی نہیں دی تھی۔ آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔''

''نہیں! آپ نے گالی دی تھی۔''

''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

''جی آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔''

میرے پاس کوئی گواہ نہیں تھا۔ اس لیے اب میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔

''ٹھیک ہے، اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو چلیے کوئی بات نہیں ۔ **لعنۃ اللہ علی الکاذبین** ۔ چلیے! آپ بھی پڑھیے! **لعنۃ اللہ علی الکاذبین** !''

''ارے ارے ! تو کیا بک رہا ہے؟'' مفتی نسیم صاحب نے گھبراہٹ اور ہڑبڑاہٹ میں مجھے ٹوکا۔

''یہ لوگ مجھے جھٹلا رہے ہیں اور میرے پاس کوئی گواہ نہیں۔ ایسی صورت میں، میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں؟''

اب مفتی صاحب اصل مدعے پر گویا ہوئے:

''ان حضرات نے بتایا کہ آپ کی جماعت کے طلبہ نے حضور اعلیٰ حضرت کی کتاب چھپوانے کے لیے کچھ روپے جمع کیے تھے۔ اب حضور اعلیٰ حضرت کا کوئی ایسا رسالہ مل نہیں رہا ہے۔ یہ لوگ میرے پاس آئے تو میں نے کہا کہ کتاب اعلیٰ حضرت کی چھپوائیں یا ان کے والد ماجد حضرت علامہ نقی علی خاں کی چھپوائیں، بات ایک ہی ہے۔ علامہ نقی علی خاں کا ایک رسالہ میلاد و قیام کے اثبات پر ہے۔ بہت ہی فاضلانہ رسالہ ہے۔ کبھی یہ رسالہ چھپا تھا۔ ابھی نایاب ہے۔ آپ حضرات اسے ہی چھپوالیں۔''

''تو یہ لوگ ابھی کیوں آپ کے پاس آئے؟ انہیں تو بہت پہلے آنا تھا۔ جماعت کے سارے طلبہ کی میٹنگ ہوئی۔ تمام طلبہ نے بالاتفاق ایک فیصلہ لے لیا۔ اس پر بھی یہ حضرات خاموش رہے۔ پھر اس فیصلے پر جب کئی دن گزر گئے اور آدھا کام ہو گیا، تو اب یہ حضرات آپ کے پاس آئے۔ پھر دونوں باتوں پر ووٹنگ ہوئی۔ طلبہ تقریباً نصف نصف ہو گئے ۔ تو اب تو پیسے تقسیم ہو جانا چاہیے۔ یہ لوگ مفتی نقی علی خاں صاحب کی کتاب چھپوالیں، ہم اپنی کتاب چھپوا لیتے ہیں۔''

''میرے عزیز! وقف کی رقم جس مد کی ہو، اسے اسی میں صرف ہونا چاہیے۔ اب وہ مد بعینہ باقی نہیں رہا۔ لیکن اس کا ایک نعم البدل موجود ہے، لہٰذا اس رقم کو آپ حضرات اسی میں صرف کر دیں۔''

میں ذرا جھجھکا۔ پھر فوراً ہی یہ سوال ذہن میں آیا: ''حضور! اگر وقف کا مد باقی نہ رہے اور تمام واقفین اس کے متبادل مد میں صرف کرنے کا اتفاق کر لیں تو کیا وہ ایسا نہیں کر سکتے؟''

''وہ تو ٹھیک ہے۔لیکن ابھی آپ کی جماعت کے طلبہ درس مسلم میں آئیں گے۔ میں ان کے سامنے یہ بات رکھوں گا۔آپ خاموش رہیے گا۔علامہ نقی علی خاں صاحب کی کتاب بہت اہم ہے،اسے چھپنا چاہیے۔''

اس دن درس مسلم شروع کرنے سے قبل حضرت مفتی صاحب نے ایک مختصر تمہید کے ساتھ مذکورہ بالا تجویز رکھی۔سارے طلبہ مجھے دیکھ رہے تھے اور میں مسلم شریف میں نگاہ گڑائے خاموش بیٹھا تھا۔جب درس گاہ سے باہر ہوا،میرے تمام ہم نوا مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

''آپ خاموش کیوں تھے؟ آپ کو کچھ بولنا چاہیے تھا۔''

میں نے ان بے چاروں کو جب تفصیل سنائی تو پھر سب سناٹے میں آ گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ مورخ مستقبل میں جب رضویات کی تاریخ لکھے گا تو اسے فرزندان اشرفیہ کے ساتھ،طلبۂ اشرفیہ کی زریں خدمات کو بھی جلی حروف میں لکھنا ہوگا۔فتاویٰ رضویہ کی اولین تدوین واشاعت میں مولانا عبدالرؤف بلیاوی،مفتی عبدالمنان اعظمی اور دیگر فرزندان اشرفیہ نے تاریخی کردار ادا کیا ہے،جب کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے بے شمار رسائل،اشرفیہ کے طلبہ نے اپنی کوششوں سے شائع کیے ہیں۔اشرفیہ کے طلبہ کلاس وائز روپئے جمع کرتے اور فراغت کے سال اعلیٰ حضرت کا کوئی نہ کوئی رسالہ شائع کرتے۔یہ خود ایک تفصیلی تحقیق کا موضوع ہے۔اشرفیہ کے کسی فاضل کو اس موضوع پر ایک تفصیلی اور تحقیقی مقالہ لکھنا چاہیے۔

ہماری جماعت کے طلبہ شروع سے ہی پانچ پانچ روپئے ماہانہ جمع کرتے تھے۔یہ سلسلہ غالباً خامسہ کے بعد سے منقطع ہوگیا تھا۔لیکن رقم ٹھیک ٹھاک جمع تھی۔فضیلت کے سال ہمیں اعلیٰ حضرت کے کسی مخطوطے کی تلاش ہوئی۔اس سیاق میں مدیر ماہ نامہ اشرفیہ مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب سے ہم نے ملاقات کی۔مولانا نے جو گفتگو کی اس سے ہماری فکر کا قبلہ تبدیل ہوگیا۔مولانا نے کہا کہ جس کام کی تم لوگ بات کر رہے ہو،اس کا آغاز طلبۂ اشرفیہ نے اس زمانے میں کیا تھا،جب کوئی اعلیٰ حضرت کی کتابیں چھاپنے والا نہیں تھا۔اب تو ان کے نام پر درجن بھر اکیڈمیاں وجود میں آچکی ہیں،جو یہ کام کر رہی ہیں۔اب بھی تم اسی جہت پر کیوں سوچتے ہو؟ دوسری بات یہ ہے کہ اب اعلیٰ حضرت کے مخطوطے ہیں کہاں،جو تم شائع کروگے۔اگر کسی نے ایک آدھ دبا کے رکھا بھی ہوگا تو وہ

تمہیں کیوں دے گا؟ اس وقت متعدد ادارے اس کی تلاش میں ہیں۔ بالفرض اعلیٰ حضرت کے غیر مطبوعہ رسائل ہوں بھی تو لاؤ جتنے ہوں میں چھاپ دوں۔

پھر؟

پھر یہ کہ تم لوگوں کو خود کسی موضوع کے تحت مقالات لکھنے چاہیے اور ان کا مجموعہ شائع کرنا چاہیے۔

لیکن طلبہ تو اس پر معترض ہوں گے؟ کیوں کہ یہ پیسہ اعلیٰ حضرت کا رسالہ چھاپنے کے لیے ہی جمع ہوا ہے۔

تم طلبہ کی میٹنگ کرلو اور ان کے سامنے میری تجویز رکھ دو۔ اگر انہیں میری بات سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر جو چاہیں کریں۔ ویسے یہ بات ضرور پہنچا دینا کہ بالفرض اگر ایک نہیں دو چار دس غیر مطبوعہ رسالے بھی مل جائیں تو میں ان کو چھاپنے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے میرا مدعا یہ ہے کہ طلبہ کے اندر تحریر و قلم کا جو جوہر پوشیدہ ہے، وہ نکھر کر سامنے آئے۔

ہم نے استاذ گرامی مولانا نفیس احمد مصباحی اور بعض دیگر اساتذہ سے مشورہ کیا۔ سب نے مولانا مبارک صاحب کی بات کی تائید کی۔ چنانچہ میٹنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ متعینہ شب بعد نماز عشا میرے احباب نے تجدید اعلان کرتے ہوئے ہاسٹل کا چکر لگایا۔ قمر بھائی، جن کے معترض ہونے کا مجھے خدشہ تھا، میں خود دو تین بار ان کے کمرے میں گیا اور انہیں میٹنگ میں پہنچنے کی دعوت دی۔ ہر بار مسکراتے ہوئے یہی کہا کہ میں جلد ہی آرہا ہوں، لیکن حسب توقع وہ نہیں آئے۔ بہر کیف! میں نے طلبہ کے سامنے مولانا مبارک صاحب کی تجویز رکھی اور پورے ہال نے بلا تامل اور بلا اختلاف اس تجویز پر مہر تائید ثبت کر دی۔

سوال ہوا کہ جماعت میں تو ۱۵۰ سے زائد طلبہ ہیں، پھر سب کے مضامین کیسے چھپیں گے؟ اس کا حل یوں تلاش کیا گیا کہ ۳۰/۳۵ عناوین دیوار پر آویزاں کر دیے جائیں، حسب پسند احباب اپنا عنوان کسی ذمہ دار کے پاس لکھوا دیں، البتہ ایک عنوان پر زیادہ سے زیادہ تین طلبہ ہی لکھنے کے مجاز ہوں گے، پھر ایک عنوان پر جو سب سے اچھا مقالہ ہوگا، اسے شائع کر دیا جائے گا۔ خوشی خوشی میٹنگ سماپت ہوئی اور جماعت کے اندر ذوق وشوق کی ایک نئی فضا قائم ہوگئی۔

اگلے دوتین دن مرکزی موضوع اور اس کے تحت ذیلی عناوین کے انتخاب میں گزر گئے۔ بالآخر متعدد اساتذہ کی مدد سے ''دعوت دین'' کے تحت ۳۰/۵ عناوین متعین ہو گئے اور لسٹ دیوار پر آویزاں کر دی گئی۔ آناً فاناً طلبہ نے اپنا عنوان منتخب کیا اور اپنے موضوع کے مطالعے میں لگ گئے۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو اب خبر ملی کہ قمر بھائی اپنے بعض دوستوں کے ساتھ حضرت مفتی نظام الدین صاحب قبلہ کے پاس گئے تھے اور مفتی صاحب نے حضرت مفتی نقی علی خان صاحب کی کسی کتاب کی اشاعت کی تجویز رکھی ہے۔ ہمیں زور کا جھٹکا لگا۔ چوں کہ ہم لوگ دوسری سمت میں قدم بڑھا چکے تھے اور کافی آگے بڑھ چکے تھے۔ ہمارے احباب اب بیک ہونے کو تیار نہیں تھے۔

پھر غالباً مفتی صاحب کی طرف سے ہی یہ تجویز آئی کہ ووٹنگ کر لو۔ جدھر زیادہ ووٹ پڑے اس پر فیصلہ کر لو۔ میں بہت خوش اور پر اعتماد تھا۔ لیکن اچانک سے راتوں رات یوپی بہار کی فضا قائم ہو گئی اور بہار ادب کے زبر کو زیر کر دیا گیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ کہاں کل میری تجویز بلا اختلاف قبول ہوئی تھی، جب ووٹنگ ہوئی تو نتیجہ نصف نصف پر آ گیا۔

بات صرف یہ تھی کہ میں چمپارن، بہار کا تھا اور قمر بھائی بریلی، یوپی کے تھے۔ قمر بھائی بھی جماعت ثالثہ میں اسٹرائک کے سال ہی آئے تھے۔ اتفاق یہ کہ پہلے ہی امتحان میں میں ایک نمبر پر آیا اور وہ دو نمبر پر۔ پھر سالانہ امتحان میں یہ ترتیب پلٹ گئی، جس کا سلسلہ آخر تک چلتا رہا۔

خبروں کے مطابق جب قمر بھائی اپنے نمبر سے نیچے گرتے تو انہیں بہت تکلیف ہوتی، لیکن جب میں نیچے گرتا تو الحمد للہ! مجھے کبھی تکلیف نہیں ہوئی، جس کی وجہ میری افتادِ طبع کے علاوہ یہ بھی تھی کہ میں ہمیشہ قمر بھائی کو خود سے زیادہ محنتی، باذوق اور باصلاحیت تسلیم کرتا رہا۔ انہیں اردو زبان و ادب کا بھی اچھا ذوق تھا۔ ناول اور افسانے بھی پڑھتے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتابیں بھی خوب پڑھتے، جو فکر و ادب کا شہکار مانی جاتی ہیں، اگرچہ مجھے ندوی صاحب نے کبھی امپریس نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود قمر بھائی بہار ادب سے کبھی وابستہ نہ رہے، نہ تحریری سرگرمیوں میں کبھی کوئی حصہ لیا۔

قصہ مختصر! جب ووٹنگ کے بعد بھی مسئلہ حل نہیں ہوا اور ہمارے احباب نے اپنے حصے کی نصف رقم لینے کا مطالبہ کیا تو پھر ایک دن مفتی صاحب نے مجھے بلا کر اس نزاع کے تصفیہ کی وہ خاص صورت نکالی جو اوپر مذکور ہوئی۔ مفتی صاحب کے فیصلے کے بعد ہمارے ہاتھ پاؤں ایک دم سے پھول گئے۔ چوں کہ اب تک بہت سے احباب مقالہ لکھ چکے تھے اور جاگتی آنکھوں سے یہ خواب دیکھ لیا تھا کہ ان کا مقالہ کتابی شکل میں مدوَّن ہے۔ اب ہمارے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں سپر اندازی کے لیے مکمل تیار تھا۔ اس موقع پر جن احباب نے سب سے زیادہ میری ڈھارس بندھائی وہ تھے جناب عارف اقبال اور سرفراز۔ احباب نے کہا کہ ہم لوگ پیسے جمع کریں گے اور جو کم پڑے گا اس کا باہر سے انتظام کریں گے۔ لیکن اپنی کتاب آئے گی۔ ان کی باتوں سے مجھے حوصلہ ملا اور میں نے قدم بڑھا دیے۔ احباب کی ایک بڑی تعداد نے میرا ساتھ دیا، جن میں ظفر الدین برکاتی اور جاوید اختر ہر موڑ پر شانہ بہ شانہ بلکہ پیش پیش رہے۔ ۱۵ ہزار کے قریب احباب نے جمع کیے اور تقریباً اتنی ہی رقم قصبہ کے مخیرین سے وصول کی گئی، جس میں عزت و ذلت ہر دو کا سامنا رہا۔ بالآخر ہماری کتاب تیار ہوگئی۔ حضرت مصباحی صاحب نے اس پر تقریظ لکھی اور خود ہی یہ نام تجویز فرمائی: ''دینی دعوت: اصول، تقاضے اور داعیوں کی زندگی''۔

میرے تعلق سے فضا میں ایسی خبریں گردش ہوئی تھیں کہ جناب کو مصنف اور قلم کار بننے کی فکر ہے، اس لیے اس مجموعۂ مقالات میں میرا کوئی مقالہ شامل نہیں ہوا۔ احباب کے اصرار پر ابتدائیہ لکھا، اس پر بھی میں اپنا نام دینے کے لیے تیار نہیں تھا، مگر ظفر الدین برکاتی اور جاوید اختر صاحبان کے اصرار پر مجھے وہاں اپنا نام لکھنا پڑا، لیکن مرتب کے طور پر میں نے اپنا نام نہیں دیا اور اس سلسلے میں کسی کی نہیں سنی، ظفر الدین برکاتی اور جاوید کی بھی نہیں اور انہی دونوں ساتھیوں کو مرتب بنا دیا۔ یہ دونوں اس کے حقدار بھی تھے، اس لیے کہ انھوں نے بڑی قربانی دی تھی۔ مزید یہ کہ ان میں ایک صاحب یوپی کے تھے اور دوسرے صاحب کرناٹک کے۔ میرا احساس تھا کہ ان کے مرتب بننے سے بہار ادب پر کسرے کی تہمت آپ در گور ہو جائے گی۔

اشرفیہ کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا کام تھا، جو بعد میں قابل تقلید ثابت ہوا۔

❁❁❁❁

آتش امتحان

امتحان کی راتوں میں تارے ہی نہیں، آسمان بھی فرش اشرفیہ پر اتر آتا تھا۔ ان دنوں بجلی کا حال شہاب ثاقب سے کم نہ ہوتا۔ ٹھیک گیارہ بجے جنریٹر بند ہو جاتا۔ اس سے پہلے طلبہ لیمپ اور ماچس تیار رکھتے۔ لائٹ جاتے ہی لیمپ روشن کر دیے جاتے۔ کمروں میں، پارکوں میں، چھتوں پر، زینوں پر، عزیز المساجد کے چھوٹے چھوٹے گنبدوں میں، تعمیر کے لیے لگائے گئے چھجوں پر، بلم اور بانسوں کے ڈھیر پر، مزار کے چاروں طرف، سڑک کے کنارے، اسٹیج پر، پتھر اور ریت کے ٹیلوں پر، دائیں بائیں، اوپر نیچے، جہاں دیکھیے، برسات کی راتوں میں سبز درختوں پر جگنوؤں کا گمان گزرتا۔ ہر جگہ طلبہ اپنا چراغ جلائے اور سر جھکائے پڑھنے میں مصروف ہوتے۔

شوال میں ہما ہمی، ذی قعد میں درس گاہ کا لطف، ذی الحج میں پڑھنے کا خیال، بعد محرم یا حسین! اب تو پڑھنا ہی پڑھے گا، نہیں تو فیل ہو گئے تو کیا ہوگا؟ اب گاڑی ٹریک پر آتی، پہلے پیسنجر، پھر ایکسپریس، پھر راجدھانی اور صفر آتے آتے بلیٹ ٹرین بن جاتی۔ اب دیکھیے تو کسی کو چار دن ہو گئے اب تک نیند نہیں آ رہی ہے، کسی کو جن پکڑ لیا، کسی کا اسکرو ڈھیلا ہو گیا اور اب وہ پڑھائی چھوڑ کر کچھوچھہ کی حاضری لگا رہا ہے یا مینٹل ہاسپیٹل کا چکر کاٹ رہا ہے۔

رات رات بھر بچے پڑھ رہے ہیں۔ عجب شوق، عجب جنون، عجب دل لگی۔ کسی کا چہرہ اترا ہوا ہے، کسی کے بال اَٹے ہوئے ہیں تو کسی کے کپڑے اتنے گندے ہو گئے ہیں

کہ کرتے کا سفید بٹن بھی سیاہ پڑ گیا ہے۔ کچھ مستانے وہ ہیں جن کا مشن صرف جاگنا ہی ہے اور کچھ وہ بھی ہیں جو بازو والے سے بات کر رہے ہیں اور یونہی ملے جا رہے ہیں۔

اشرفیہ کے طلبہ کا جوہر، اعتماد ہے۔ یہی اعتماد، ان کا کل سرمایہ ہے۔ میں اسے سلام کرتا ہوں۔ اگرچہ ان کا اعتماد بسا اوقات over بھی ہو جاتا ہے اور وہ علم سے زیادہ مصباحیت کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ ان کو یہ یقین حاصل رہتا ہے کہ ہم کوئی بھی کتاب سمجھ سکتے ہیں اور رٹ سکتے ہیں اور اب تو سمجھنے سے زیادہ رٹنے پر ارتکاز ہے۔

اب یہ دیکھیے حافظ ملت کے مزار کے پیچھے یعنی مغرب کی جانب ایک طالب علم پندرہ منٹ سے یہی رٹے جا رہا ہے: **الحمدللہ رب العالمین، و العاقبۃ للمتقین۔**

دوسرا شمال کی دیوار سے چپکا ہوا ہے اور حسامی کی شرح لیے پچھلے آدھے گھنٹے سے بار بار یہی دہرائے جا رہا ہے: ''یہ بحث اگلے صفحے پر آئے گی۔ یہ بحث اگلے صفحے پر آئے گی۔ یہ بحث اگلے صفحے پر آئے گی۔۔۔''

سیتامڑھی کے اظہر القادری اپنے سینئر عنایت اللہ کے سامنے خربوزہ کی طرح منہ کھولے کہہ رہے ہیں: ''اے پیر صاحب! چار دن سے سویا نہیں ہوں۔ نیند ہی نہیں آ رہی ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں میں پگلا نہ جاؤں۔''

''دُر مردے! تو غسل نہ کرَہ ہوکا، نہا لیا کرَ، سب ٹھیک رہیَا۔''

''ارے پیر صاحب! ابھی دو گھنٹہ تک حوض میں نہا کر آ رہا ہوں۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ پیر صاحب کچھ کیجیے۔''

روم نمبر ۱۶ سے خوف ناک چیخ بلند ہو رہی ہے۔ پورا ہاسٹل اس آواز کی طرف بھاگ رہا ہے۔ ارے کیا ہوا؟

ارے یار وہی خبیث ہے۔ بہت پریشان کر رہا ہے۔ بے چارے کی بینائی چلی گئی۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

کچھو چھہ سے کیا ہوا؟

وہاں کئی لوگ گئے تھے۔ ایک صالح جن مسلط کیے گئے ہیں، جو اس خبیث سے حفاظت کریں گے۔

ارے چلو چلو! حافظ ملت کے آستانے میں چلو۔ جن صاحب نے کہا ہے کہ اس کی آنکھ کی بینائی صحرا میں چر رہی ایک کالی بکری کی گردن میں لٹک رہی تعویذ میں ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ پٹی باندھ کر حضور حافظ ملت کی بارگاہ میں لے چلو۔ حافظ ملت کی قبر کی مٹی اس کی آنکھ پر لگاؤ اور پھر آہستہ آہستہ پٹی کھول دو۔ ان شاء اللہ! بینائی آجائے گی۔

حافظ ملت کے آستانے پر پہنچے۔ فضیل رشیدی کی آنکھوں پر پٹی تھی۔ حافظ ملت کا آستانہ بھرا ہوا، بلکہ کسا ہوا تھا۔ تماشہ بینوں میں میں بھی تھا۔

راستہ چھوڑ دو۔ گیٹ پر کوئی نہ رہے۔

فاتحہ پڑھی گئی۔ مزار حافظ ملت کی پائنتی جانب تھوڑا سا حصہ کچا ہے۔ چادر اٹھا کر کسی نے تھوڑی سی مٹی نکالی اور فضیل کی آنکھوں سے لگائی۔ چند ثانیے سب منتظر رہے۔ پھر اچانک جیسے فضیل کا بدن کانپ سا گیا۔ بینائی واپس آ گئی۔ پٹی کھولو۔ کسی نے پٹی کھولی اور فضیل نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ فضیل جیسے رقص کرنے لگا ہو۔ طلبہ کی اور خصوصاً فضیل کے ساتھیوں کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔

ایک طالب علم پچھلے دو گھنٹے سے پڑھتے پڑھتے تھک چکا ہے۔ اب وہ دور ایک دوسرے ساتھی کے پاس پہنچتا ہے: رئیس بھائی! آج مصباحی صاحب نظر آئے تھے؟

بھائی تو میرے پاس سے جا۔ میں مصباحی صاحب کا سکریٹری نہیں ہوں!

سلیم بھائی! کون سی کتاب پڑھ رہے ہیں؟ اچھا میچ کا کیا رہا؟ آج آپ کے شاہد آفریدی تو بہت کم رن پر آؤٹ ہو گئے؟

بیٹا! تو میرے پاس سے جا۔ ابھی ابھی آدھے گھنٹے تک ارشاد چاٹ کر گیا ہے۔ پھر تو اپنا موڈ فریش کرنے آ گیا۔ چل نکل، میں کسی شاہد آفریدی کو نہیں جانتا۔ تم لوگ اپنا پڑھ لیتے ہو، پھر اس کے بعد موڈ فریش کرنے کے لیے گھوم گھوم کر کے دوسروں کا ٹائم خراب کرتے ہو۔

ارے یار، کوئی سنتا ہی نہیں۔ چلو۔۔ کچھ تو موڈ بنا۔ اب پھر چلتے ہیں، کچھ پڑھ لیں۔

پچھلے ایک گھنٹے سے خاموشی ہے۔ جیسے سب ہلتے ہوئے سو گئے ہوں۔ اتنے میں کسی نے پتھر اٹھایا اور بجلی کے کھمبے پر ٹن سے مارا۔ کسی نے ڈانٹا: کیا یار؟ تم پڑھنے نہیں دیتے؟ ارے یار! نہیں پڑھنا، جاؤ سو جاؤ۔ ڈسٹرب کیوں کر رہے ہو؟ اب پورے میدان

میں ایک ہی آواز اٹھ رہی ہے: ہٹ، ہٹ، ہٹ، ہٹ، ہٹ، ہٹ، ہٹ۔۔۔۔غصہ ختم، تکان دور، اوراب پھر سے پڑھائی شروع۔

ارے ذیشان بھائی! ارے یار، آپ تو کچھ سمجھتے ہی نہیں، ابھی ساڑھے گیارہ بھی نہیں بجے اور آپ سونے جارہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں قمر تین تین بجے تک پڑھتا ہے۔ آپ کو کیا؟ آپ کو تو کچھ ہوتا نہیں؟ ارے یار! آپ اپنے لیے مت پڑھیے، ہم لوگوں کے لیے پڑھیے، بہار کے لیے پڑھیے۔ جانتے ہیں، آپ نیچے آجاتے ہیں تو ہم کو کتنی تکلیف ہوتی ہے؟

نہیں ریاض بھائی! ہم نے دن میں پڑھ لیا ہے اور آپ کا ہے پریشان ہیں؟ آپ کی دعا ہے نا، ان شاءاللہ، دیکھیے۔

ارے ذیشان بھائی! اس بار آپ ہماری لاج رکھیے گا۔ یار! وہ لڑکا جو آپ کی جماعت میں ہے نا، وہ پتلا لمبا سا، چشمہ والا۔ یار! وہ آپ کو متکبر کہہ رہا تھا اور بھی آپ کے بارے میں بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ بہت متکبر ہے۔ اب اس کے بس کا نہیں کہ وہ ایک نمبر پر آئے۔

پھر تم نے کیا کہا؟

ارے ذیشان بھائی، میں نے کہا: تم غلط کہہ رہے ہو، ذیشان بھائی ایسے نہیں ہیں اور میں چیلنج کر رہا ہوں وہ اس بار ایک نمبر پر ضرور آئیں گے۔ اگر نہیں آئے تو شرط رکھ لے۔ میں نے بریانی اور پیپسی کی شرط رکھ دی ہے۔

ارے یار اسلم! تم نے تو مجھے ڈُبا دیا۔ تم نے یہ شرط کیوں لگا دی کہ میں آ ہی جاؤں گا۔ اس کی کیا گارنٹی؟

ہے گارنٹی ذیشان بھائی، ان شاءاللہ! میری دعا ہے۔ اور دیکھیے گا۔ میں شرط جیتوں گا۔

تم بھی یار! میری بے عزتی کا ڈبل انتظام کر کے آ گئے۔ لیکن جہاں تک اس کا مجھ کو متکبر کہنا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر چہ وہ میری جماعت میں ہے، لیکن اس نے اب تک مجھے صرف دور سے دیکھا ہے، قریب سے نہیں دیکھا ہے۔ میں اس کے اس خیال کو تو ان شاء اللہ بدل کر ہی دم لوں گا، لیکن میرا رزلٹ کیسا ہوگا، اس کی میرے پاس کوئی گارنٹی نہیں۔

میں نے اگلے ایک مہینے تک ان صاحب کو اتنا سلام کیا اور اتنی تواضع دکھائی کہ اب ان کی نظر میں مجھ سے زیادہ با اخلاق طالب علم کوئی اور رہا ہی نہیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا واقعہ ہے جب میں نے چیلنج کر کے کسی کے سامنے خود کو با اخلاق ثابت کیا ہو۔ اللہ کا کرنا کہ اس بار اسلم کشی نگری اپنی شرط جیتنے میں بھی کامیاب رہا۔

صوفی غلام مدثر صاحب اذان خانے میں رہا کرتے تھے۔ دوڈھائی ذیشان کے برابر تو وہ اسی وقت تھے، لیکن اس کے باوجود ہمیشہ انہیں اپنی صحت کی فکر دامن گیر رہتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ مقویات خوب رکھتے۔ دریا دل تھے، کھاتے اور کھلاتے۔ امتحان کی تیاری کی راتوں میں کبھی کبھار ان کے کمرے میں چلا جاتا تو عام طور سے بارہ ایک بج جاتے۔ اس دوران پڑھائی تو کم ہی ہوتی مقویات کھاتے اور صوفی صاحب سے علمی تبادلۂ خیال کرتے۔ ایک رات بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے کہا:

''صوفی صاحب! اب تھوڑی دیر اور جاگ لیتے ہیں تاکہ اشرفیہ میں پوری رات پڑھنے کا میرا ریکارڈ بھی بن جائے اور اس جنت ارضی سے یہ ارمان بھی ادھورا لے کر نہ نکلوں۔''

امتحان کی صبح بعض طلبہ آخری وقت تک پڑھتے رہتے اور جب آغاز امتحان کی گھنٹی بجتی تو آنکھ نکالے اور پاجامہ درست کرتے، امتحان گاہ کی طرف بھاگتے۔ میرا حال یہ تھا کہ جوں جوں وقت قریب آتا دماغ کام کرنا بند کر دیتا، اس لیے کافی پہلے ہی پڑھنا چھوڑ دیتا۔ موڈ فریش کرتا، چائے شائے لیتا اور پھر اطمینان سے امتحان گاہ کے لیے نکلتا۔

امتحان کے ایام میں مسجد اور مزار دونوں بھر جاتے۔ امتحان کی صبح نماز فجر چھوٹ سکتی تھی، لیکن امتحان گاہ جانے سے قبل بارگاہ حافظ ملت میں فاتحہ نہیں چھوٹتی تھی، حتیٰ کہ ہم جیسے وہابی مزاجوں کی بھی نہیں چھوٹتی تھی جن کو مزار حافظ ملت میں گئے ہوئے کبھی کبھی ہفتوں بیت جاتے، ان سنیوں کا جوش عقیدت تو دیدنی ہوتا جو عام دنوں میں بھی کتاب کم، فاتحہ زیادہ پڑھتے تھے۔

۱۹۹۹ء میں میرا داخلہ ہوا تھا، اس لیے میرا نام اس سال بہت نیچے تھا۔ لیکن اسٹرائک ہوجانے کی وجہ سے کچھ ترقی ہوگئی۔ میں نے امتحان ہال میں اپنا رول نمبر لکھا۔

مولانا نفیس صاحب نگراں تھے، انہوں نے کہا: ''میاں چھا چھٹ نہیں، چھیاسٹھ ہوتا ہے۔''
اس دن سے میرا، ۶۶ ر کا املا درست ہو گیا۔ میں آج بھی اپنے طلبہ کا یہ رول نمبر درست کراتا ہوں تو مولانا نفیس صاحب کو یاد کرتا ہوں۔

امتحان گاہ میں سناٹا رہتا۔ لیکن اہل فن کا وہاں بھی مظاہرہ ہوتا۔ بطور خاص اگر مولانا جلال الدین صاحب نگراں ہیں تو بسا اوقات وہ بھول ہی جاتے کہ وہ امتحان گاہ میں ہیں یا جلسہ گاہ میں۔ اگر وہ ''خاموش۔۔۔!'' بھی کہتے تو اس بلند آہنگ سے کہ امتحان ہال گونج جاتا۔ حضرت کر بھی کیا سکتے تھے۔ اپنی آواز، انداز اور مزاج کے ہاتھوں مجبور تھے۔ بیچ بیچ میں تبصرے بھی چلتے:

''ذیشان بھائی! یار تم کاپی کتنی اچھی لکھتے ہو۔ ایک وہ تھا بیہودہ، احتشام، کلاس کے وقت بھی ڈنڈا لے کر گیند مارنے میں لگا رہتا اور اپنے ساتھ دو تین اور بیہودوں کو لگائے رہتا۔ پڑھائی سے کوئی مطلب نہیں۔ لیکن امتحان میں جب کاپی لکھتا تو پوری کتاب چھاپ دیتا۔ اس کے بعد اگر کسی کی کاپی پسند آئی تو ذیشان بھائی آپ کی آئی۔ واہ صاحب زندہ باد!۔۔۔اوے، سیدھے بیٹھو، سر پھوڑ دوں گا۔''

اگر امتحان گاہ میں حضرت مفتی بدر عالم صاحب ہیں تو پھر ایک الگ ہی سین ہوتا۔ کسی کی شامت آئی اور وہ ان سے سوال سمجھنے چلا گیا تو انتہائی خیر خواہانہ جذبے سے سرشار چاروں طرف دیکھتے اور سائل کے کان میں جواب بھی بتا دیتے۔ یہ جواب کیا ہوتا mango کے معنی ناسپاتی اور گھٹنے کے معنی سر ہوتا۔ جامعہ کا نیا طالب علم مفتی صاحب کو دعائیں دیتا ہوا امتحان گاہ سے باہر آتا اور جب اس پر حقیقت حال کھلتی تو زندگی بھر کے لیے مفتی صاحب سے امتحان گاہ میں ہی کیا، درس گاہ میں بھی پوچھنا بھول جاتا۔

شعبۂ قرات کے شیخ الحدیث اور دو پلیٹ سنڈے کا آرڈر دینے والے (یہ ساری باتیں طلبۂ اشرفیہ کی اڑائی ہوئی ہیں، اتفاقات کا ذمہ دار میں نہیں) حضرت حافظ و قاری مقری و مجود شیخ جلال الدین قادری صاحب کے لطیفے رہ ہی گئے۔ خیر! اب امتحان ہال میں ہی ان کا جلوے دیکھیے۔ بقول غیر معتبر راویوں کے، قاری صاحب امتحان کے عربی پرچے بہت غور اور کسی قدر تجوید سے پڑھتے۔

ویسے قاری صاحب تھے دل کے صاف اور طلبہ واساتذہ کے لیے فیاض وخیر خواہ۔

ایک دن امتحان کے دوران ادریس چپراسی پر سخت غضب ناک ہو گئے۔ فرمانے لگے:

’’جاؤ، دَدفع ہو جاؤ۔ میں تم کو دیکھنا نہیں چاہتا۔‘‘

ادریس نے اپنے خاص لہجے میں جواب دیا:

’’ارے قاری صاحب! دیکھنا نہیں چاہتے تو اپنی انکھیا بند کر لیجیے۔‘‘

قاری صاحب نے تو اس وقت کچھ نہیں بولا، لیکن اس کا حساب دوسرے دن لیا۔

یہ چند سطریں قاری صاحب جیسی مجمع اللطائف شخصیت کے لیے ناکافی ہیں۔ لیکن قارئین فی الحال اسی پر اکتفا کریں۔ ۲/اکتوبر کی جگہ ۱۲/کبوتر، سمینار ہال کی جگہ سنیما ہال، المنجد کی تدریس، میں تیرہ سال سے سالا کچھ نہیں، اور دیگر بہت سی باتیں پھر کبھی۔

ہمارے ساتھ ہمارے عارف اقبال جیسے ذہین وفتین لوگ بھی تھے جن کو امتحان کی رات اچانک یاد آتا کہ کل امتحان ہے: ’’ذیشان بھائی! کل حمد اللہ کا پیپر ہے۔ دیکھیے کچھ بھی تیاری نہیں ہے۔ حافظ رافت سے تین جگہ کی تیاری کر کے آرہا ہوں۔ زیادہ نہیں، صرف تین جگہ سے گیس کر کے پڑھا دیجیے۔ اور دیکھیے! ہم کو عبارت نہ سنائیے، بس ایک بحث پر ایک پوری تقریر کر دیجیے اور پھر مجھ سے سن لیجیے۔‘‘

باری باری تین مباحث کی تقریر کی اور فوراً سن بھی لیا، معمولی ایک آدھ جگہ اصلاح کی ضرورت پڑی، تیاری بمپر، امتحان شاندار، نمبر ۶۵۔

امتحان گاہ سے باہر نکلتے تو ایک ہی سوال ہوتا، ارے یار! ٹکرایا کہ نہیں، جن طلبہ نے صرف اندازے سے چند اسباق پڑھے ہوتے اگر ان میں سے چند سوالات ٹکرا گئے تو چلاتے ہوئے ہاسٹل میں گھستے: ٹکرا گیا، ٹکرا گیا۔۔۔ اور اگر نہیں ٹکرایا تو ایسے گھستے جیسے کسی نے گھٹنے کے علاج کے لیے بیہوش کیا ہو اور گردہ نکال کر فرار ہو گیا ہو۔ اسی طرح کا ایک واقعہ جاوید بھائی کے ساتھ ہوا۔ عارف اقبال، غلام نبی اور جاوید، یہ تینوں انگریزی کے ستائے ہوئے تھے۔ امتحان کی رات تیاری کرتے۔ مضمون وغیرہ رٹتے اور کسی طرح ۳۳ نمبر کا انتظام کرتے۔ ایک بار ان میں سے ایک نے Eid پر چٹ بنائی۔ سب کو معلوم تھا۔ امتحان سے نکلنے کے بعد عارف اقبال نے پوچھا: اور چنٹو! آج تو تمہارا ٹکرا گیا تھا، پھر منہ کیوں لٹکائے ہو؟

کہاں ٹکرا گیا۔ موڈ خراب ہے۔

ارے یار یہ کیا ہے؟

یہ تو Islamic Festival ہے۔

اب جو قہقہہ بلند ہوا تو چنٹو نے سر پکڑ لیا۔

۲۰۰۴ء کے اواخر میں فضیلت کے سالانہ امتحان سے فارغ ہوا۔ اس بار خوشی کی جگہ ایک عجیب محرومی کا احساس اندرون میں سمایا ہوا تھا۔ لیکن اوپر سے میں بالکل بنداس تھا۔ سارے دوستوں کو ایک ایک کر کے الوداع کہتا رہا اور مسکراتا رہا۔ سرفراز اور عارف اقبال جدا ہوتے ہوئے ایسے پھوٹ کر روئے جیسے بیٹی پہلی بار سسرال کے لیے ماں سے جدا ہوتی ہے۔ میں شام تک مسکراتا رہا اور رونے والوں کے اشک پونچھتا رہا۔ لیکن جب نماز مغرب پڑھ کر عزیز المساجد کے دروازے سے اشرفیہ پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی تو دل بھر آیا۔ آنکھوں میں سیلاب امنڈ آیا۔ نہیں معلوم یہ سیلاب کہاں سے آیا تھا جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ فاتحہ پڑھی، ڈائننگ ہال گیا، مسلسل روتا رہا۔ آنکھیں موسلا دھار برستی رہیں۔ اگر کوئی غلطی سے پوچھ لیتا کہ کیا ہوا تو یہ سیلاب طوفان بن جاتا۔ اندر سے ایک ہوک سے اٹھتی اور اندر ہی دب کے رہ جاتی۔ ''کیا ہوا؟ میں کیا بتاؤں کیا ہوا؟ یہ پوچھو کیا نہیں ہوا؟ بچے کو ماں سے جدا کرتے ہو اور پوچھتے ہو کیا ہوا؟

حافظ ملت کے روضے، سینٹرل بلڈنگ کے گنبد، عزیزی ہاسٹل کی دیواروں، عزیز المساجد کی محرابوں، اشوک کے پودوں اور پارک کے سبزوں، ہر طرف سے یہی آواز آ رہی تھی: ''میرے عزیز! تم کہاں جاتے ہو؟''

''یہ سارے عناصر میرے وجود کا حصہ ہیں۔ میرا وجود انہی سے مل کر بنا ہے۔ بھلا کہیں کوئی اپنے سے جدا ہوتا ہے۔ لوگ اپنوں کو نہیں چھوڑتے آج میں اپنے سے جدا ہو رہا ہوں۔ کہیں بکھر نہ جاؤں۔ زندگی کے ۶ ربہترین سال جس فضا میں بسر ہوئے، میری روح اس سے جدا کیوں ہوتی ہے؟ اشرفیہ میں میرا وجود ایسے ہی ضم ہے، جیسے میری روح میرے جسم میں ضم ہے۔ کہیں کوئی جان بوجھ کر موت کو گلے لگاتا ہے؟ یہ سفر کسی طرح خودکشی سے کم نہیں۔''

یہ اور اس قسم کے خیالات میں ٹوٹتا، بکھرتا، روتا، بلکتا، اشرفیہ سے شرمندہ، نظریں چھپائے، آخری سلامی دیتے، اعظم گڑھ کے لیے روانہ ہوگیا۔ رفعت بھائی جو اشرفیہ کے گیٹ پر مجھے جیپ میں بٹھانے آئے تھے، میری حالت زار دیکھ کر میرے ساتھ وہ بھی سوار ہوگئے اور اعظم گڑھ تک چھوڑنے آگئے۔

داغ فراق وحسرت وصل، آرزوے دید
کیا کیا لیے گئے ترے عاشق جہان سے
آب خضر سے بھی نہ گئی سوزش جگر
کیا جانیے یہ آگ ہے کس دودمان سے

❁❁❁❁

انقلاب نظر

اشرفیہ میرے خوابوں کا شہر تھا، جہاں پہنچ کر میرے والد کے ادھورے خواب بھی بالواسطہ پورے ہوئے۔ والد نے اس شہر میں پہنچنے سے پہلے ہی میرے دل و دماغ پر اللہ ورسول کی محبت، غوث وخواجہ کی عقیدت، خودی وغیرت، انسانیت، فیاضی، بڑوں سے تعلق اور کم ظرفوں سے مسافت جیسے الفاظ نقش کر دیے تھے۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی کے بارے میں انہوں نے ہی بتایا تھا کہ وہ بریلی کے بہت بڑے عالم اور عاشق رسول گزرے ہیں۔ ایسے عاشق کہ جب سوتے تو اس انداز سے سوتے کہ نقش محمد بن جاتے۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ والد صاحب کی زندگی سے میں نے یہ بھی سیکھا کہ وہابیوں اور دیوبندیوں کے خلاف جدوجہد ہر وقت جاری رہنی چاہیے۔ والد گرامی کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، لیکن ان کے روابط تمام بڑے بڑوں سے تھے، عاجزانہ اور فقیرانہ نہیں، دوستانہ اور معلمانہ۔ ان کے پاس ہر طرح کے لوگ آتے جاتے تھے اور وہ سب کے ساتھ فقیری میں امیری کی شان سے پیش آتے۔ والد صاحب اپنے مسلک میں پکے تھے، لیکن اس کے باوجود مسلکی اعتبار سے مختلف الخیال لوگوں کے ساتھ بھی ان کے روابط قائم تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ مسلکی گفتگو بھی رہتی، اس میں نوک جھونک بھی چلتی، لیکن یہ بحثیں ہمیشہ رنجشوں کی جگہ قہقہوں پر ختم ہوتیں۔

گاؤں کے مکتب میں میرے دو ساتھی تھے۔ غوث الرحمٰن، جو میرے گاؤں کے پہلے مصباحی عالم مولانا خلیل الرحمٰن اشرف کے بیٹے تھے اور شمس تبریز جو مولانا عبدالوکیل کے بیٹے تھے، جو مسلکاً اہل حدیث اور مولانا خلیل الرحمٰن کے پڑوسی تھے۔ گاؤں اور علاقے میں اپنے مسلک کے

تحفظ کے لیے جدوجہد میرے والد ہی کرتے، جب کہ مولانا خلیل الرحمٰن سرکاری اسکول میں استاذ تھے، اس لیے ان کے روابط دیگر مسالک کے لوگوں کے ساتھ زیادہ وسیع اور زیادہ لچک دار تھے۔

والد صاحب کی دو باتیں اور بھی اہم ہیں۔ ایک یہ کہ صوفیہ کے ساتھ ان کا تعلق عقیدت مندانہ تھا۔ وہ پڈرونہ کے ایک نقش بندی شیخ سے بیعت تھے اور دربھنگہ کی ایک چشتی صابری خانقاہ میں آتے جاتے اور وہاں سماع کی محافل میں شریک ہوتے تھے اور دوسری یہ کہ وہ زندگی بھر سنیت کی تبلیغ اور وہابیت کی سرکوبی کرتے رہے، لیکن اپنے بچوں کی شادیاں انہی گھروں میں کیں، جن کو عرفاً وہابی یا دیوبندی کہا جاتا ہے۔

اشرفیہ پہنچنے سے قبل چاچا سعدی کو پڑھ چکا تھا، جنہوں نے مجھے سمجھایا تھا کہ طریق مصطفیٰ اور حب اہل بیت کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ انسانیت بہت بڑی چیز ہے، یہاں تک کہ تصوف؛ تسبیح وسجادہ سے نہیں، خدمت خلق سے عبارت ہے۔ اور یہ کہ جو بات ہم کھل کر نہیں کہہ سکتے اسے چھپ کر بھی نہیں کہنا چاہیے۔ اور یہ کہ اپنی بات کسی سے کہہ کر اس سے یہ کہنا کہ یہ بات تم کسی سے نہ کہنا، بہت بڑی حماقت ہے۔

جب میں نے مدارس میں قدم رکھا تو میرے مزاج میں سختی بڑھتی گئی، جو دینی تصلب کے نام پر بہت ضروری تھی۔ سب سے پہلے اپنے والد سے بدگمان ہوا کہ یہ تو اعلیٰ حضرت کا بہت نام لیتے ہیں، پھر محرم کے جلوس تعزیہ کی قیادت کیوں کرتے ہیں؟ قوالی کی محافل میں شریک کیوں ہوتے ہیں؟ اپنے بچوں کی شادیاں دیوبندی گھرانوں میں کیوں کرتے ہیں؟ ۱۹۹۹ء میں جب اشرفیہ میں قدم رکھا تو وہاں یہ سوالات مزید مستحکم ہوتے چلے گئے۔

بڑا ہو کر شمس تبریز جامعہ سلفیہ بنارس چلا گیا، جب کہ میں نے غوث الرحمٰن اور اسد اللہ خان غالب کے ساتھ اشرفیہ کا رخ کیا۔ والد صاحب نے کہا تھا کہ شمس تبریز اور غوث الرحمٰن سے زیادہ پڑھنا ہے اور اتنا پڑھنا ہے کہ قرآن کو از خود سمجھ کر پڑھ سکو۔ یہ دراصل میرے حق میں والد صاحب کی دعا تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ دعا کس حد تک مقبول ہوئی، البتہ اِن دنوں حضرت داعی اسلام کی نگہ داشت میں ''دعوت قرآن'' کے نام سے قرآن کا ترجمہ اور عصر حاضر میں آیات قرآنیہ کی بنیادی دعوت کو جب میں قلم بند کرتا ہوں تو والد صاحب کی دعاؤں کو ضرور یاد کرتا ہوں۔

۱۹۹۹ء میں جب میں اشرفیہ پہنچا تو بسا اوقات شمشاد کے ہوٹل سے اور عزیزی ہاسٹل کے سامنے والے پارک سے اشرفیہ کے بلند و بالا گنبد کو تکا کرتا تھا۔ جب بھی میں دل کی آنکھوں سے اس گنبد کو دیکھتا، میرا وجود بکھر کر اس میں تحلیل ہونے لگتا۔

جب میں اشرفیہ کے بام و در میں فنا ہو گیا تو مجھے اعلیٰ حضرت کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا۔ اس فضا میں یہ تخیل سمایا ہوا تھا کہ جو کچھ ہے اس صدی میں وہ تنہا رضا کا ہے اور یہ بات بھی کہ ''ہمہ گفتی چوں شہ رضا گفتی''۔ جہالتیں اس لیے ہیں کہ لوگ اعلیٰ حضرت کو نہیں پڑھتے۔ تحقیق کا سفر شک و ریب کے طلاطم میں ہچکولے کھاتا رہتا ہے، اگر اس کا گزر فتاویٰ رضویہ سے ہو جائے تو اسے پُرسکون کنارا مل جائے۔ فتاویٰ رضویہ علم کا وہ سمندر ہے جس کے بعد دنیا ختم ہو جاتی ہے۔

مجھے اس فضا میں یہ بھی معلوم ہوا کہ علم زوال آمادہ تھا، اعلیٰ حضرت نے اسے سنبھالا دیا اور متقدمین کے علوم و افکار کا خلاصہ فتاویٰ رضویہ کی شکل میں مدوّن کر دیا۔ اعلیٰ حضرت کے بعد مفتی اعظم ہند تھے اور اب حضور تاج الشریعہ۔

علم کے راستے میں اس تثلیث سے نکلنا، خود کو ضلالت و بے دینی کے قعر عمیق میں ڈالنا ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ اشرفیہ میں ہی ان خیالات کو پختگی ملی اور پھر اسی فضا میں یہ سارے خیالات بت آزری کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئے۔

ایک دن مولانا عبدالوحید صاحب -رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً- نے درس موطا کے دوران بتایا کہ مزارات پر چادر چڑھانے کا صرف یہ مقصد ہے کہ قبرستان میں وہ قبر نمایاں ہو جائے اور پتہ چلے کہ یہ کسی خاص ہستی کی قبر ہے۔ یہی مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔ میں نے سوچا پھر اشرفیہ اور بریلی میں چادر کا جلوس کیوں؟ مسلک اعلیٰ حضرت کے سب سے بڑے محافظ مراکز؛ بریلی اور مبارک پور ہیں، پھر انہی مراکز میں اس مسلک کا خون کیوں؟

مفتی ارشاد احمد ساحل شہسرامی، کسی قدر جھکی ضرور تھے، لیکن تھے بڑے ذی علم۔ کبھی کبھار وہ اپنا فتویٰ رجسٹر میں درج کرنے کے لیے میری خدمت لیتے۔ ایک دن ان کا فتویٰ نقل کیا۔ یہ فتویٰ دیوبندیوں سے شادی بیاہ یا معاملات کے تعلق سے تھا۔ مولانا نے اسے

ناجائز وحرام لکھا تھا، لیکن ساتھ ہی وضاحت کی تھی کہ یہ حکم ہر اس شخص کے لیے نہیں، جو عرف میں دیوبندی ہے، بلکہ دیوبندی عرفی اور دیوبندی حقیقی دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ جسے بھی عرف میں دیوبندی کہا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی دیوبندی ہو۔ دیوبندی وہ ہے جو علمائے دیوبند کی ان عبارتوں سے واقف ہو جن میں بارگاہ رسالت میں گستاخی ہے، ختم نبوت کا انکار ہے اور وہ ان باتوں کو درست بھی مانتا ہو۔

ساحل صاحب کے اس فتوے نے میرا قبلہ تبدیل کر دیا۔ میں نے کہا کہ ایسے دیوبندی ملتے کہاں ہیں، ایسوں کو تو دن کے اجالے میں چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑے گا۔ اس سے پہلے ہمارا یہ تصور بنا ہوا تھا کہ ہر دیوبندی کافر ہے اور دیوبندی سے مراد وہی تھا جسے ہم دیوبندی سمجھتے تھے۔ یعنی تبلیغی جماعت کا لوٹا اٹھایا اور کافر بنا۔

اشرفیہ کی زندگی میں میری فکر پر جو شخصیت سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی، وہ مولانا غلام مصطفیٰ انعام القادری کی تھی۔ موصوف چھپرہ بہار کے ایک ہم جماعت طالب علم تھے۔ ۱۹۹۹ء کی اسٹرائک میں اشرفیہ کو خیرباد کہہ گئے تھے۔ پھر اگلے سال دوبارہ داخلہ لیا تھا۔ درمیان میں ان کے کچھ ایام ندوہ میں بسر ہوئے تھے۔ غالباً ۲۰۰۱ء سے میری رفاقت میں آئے تھے۔ موصوف کی فکر جس قدر وسیع و بلند تھی، اندازِ نقد بھی اسی قدر جارح تھا۔ جب وہ بولنا شروع کرتے تو عارف اقبال جیسے منہ لگے ساتھی ان کو چپ کرانا شروع کر دیتے۔ ان کی آفاقی باتوں کو جتنی سنجیدگی سے میں لیتا، کوئی اور نہ لیتا۔ امت کے آفاقی تصور سے میرا ذہن انہی کی صحبتوں میں آشنا ہوا۔ اکثر و بیشتر ہم کہیں ساتھ بیٹھے مستقبل کی پلاننگ کرتے رہتے۔ وہ ہمیں بتاتے کہ مستقبل میں کام کا انداز کیا ہونا چاہیے۔ وہ بتاتے تھے کہ حافظ ملت کا خواب کیا تھا اور اشرفیہ والے اس خواب کی تکمیل کس حد تک کر سکے۔ ہر طالب علم، حضرت مصباحی صاحب کی ذہانت و بصیرت کی قسمیں کھاتا، لیکن یہ صرف جناب غلام مصطفیٰ تھے، جن کے پاس حضرت مصباحی صاحب کے لیے بھی بہت سے مشورے تھے۔ وہ علامہ ارشد القادری کے بڑے مداح تھے، لیکن علامہ کی خوبیوں اور کامیابیوں کے ساتھ، غالباً وہ ان کی خامیوں اور ناکامیوں کی بھی ایک فہرست رکھتے تھے۔ علامہ ضیاء المصطفیٰ کے سخت نقاد تھے۔ غالباً انہی کی زبانی پہلی بار میرے کان ڈاکٹر طاہر القادری کے نام سے آشنا ہوئے۔ طاہر القادری

صاحب کا تعارف یہ تھا کہ وہ ایسا خطیب ہے جس کے سامنے علامہ قمرالزماں کچھ بھی نہیں ہیں۔اس وقت میرے لیے ڈاکٹر طاہرالقادری کا یہ بہت بڑا تعارف تھا۔

مولانا غلام مصطفیٰ کی پلاننگ میں یہ بات شامل تھی کہ کام کرنے کے لیے کسی بڑی شخصیت اور ادارے کی پشت پناہی بہت ضروری ہے۔ وہ چھوٹے شکاری نہ تھے۔ان کی نظر بریلی پر تھی۔ان کا ماننا تھا کہ جو مقبولیت اور سہولت علامہ اختر رضا خان کو حاصل ہے، وہ کسی اور کو حاصل نہیں۔ان کا خیال تھا کہ علامہ اختر رضا خان کو اچھے لوگ نہ ملے۔ہمیں اگر ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے تو پھر دنیا دیکھے گی۔مولانا غلام مصطفیٰ صاحب کو اس کی امید بھی تھی اور اس کے لیے ان کے سامنے امکانات بھی تھے۔

وجہ یہ تھی کہ ان کے والد کولکاتا میں سبزی کے ہول سیلر تھے،علامہ اختر رضا خاں ازہری کے مرید و معتقد تھے،کولکاتا کے سفر میں ازہری صاحب ان کے گھر بھی قدم رنجہ ہوتے،حتیٰ کہ ازہری صاحب کے بھائی مولانا قمر رضا خاں کی صاحب زادی سے مولانا غلام مصطفیٰ کی شادی کی بات بھی چلی تھی۔مولانا غلام مصطفیٰ صاحب کے پاس مستقبل میں کام کا پورا خاکہ تھا،تعلیمی نصاب تھا، تدریسی نظم تھا،اخلاقی نظام تھا اور سب سے اہم دینی ادب کا منظم منصوبہ تھا۔مولانا اپنے اس خاکے میں ہر روز اصلاحات کرتے رہتے اور اس کے امکانات و مشکلات پر غور کرتے رہتے۔

اشرفیہ میں حافظ رافت صاحب سے بھی ہمارے بڑے یارانے تھے۔لیکن ان کی دنیا الگ تھی۔ وہ خوش پوش و خوش نوش تھے۔خوش و خرم رہنا اور درسیات پر کنٹرول حاصل کرنا ان کی زندگی تھی اور کسی سرکاری مدرسے میں ملازمت حاصل کرنا ان کی منزل۔ یہ باتیں مولانا غلام مصطفیٰ کے فکری سفر میں گرد راہ تھیں۔لیکن اس کے باوجود یارانے ہم سب کے تھے۔ جب بھی حافظ صاحب مجھے غلام مصطفیٰ صاحب کے ساتھ سنجیدہ گفتگو کرتے دیکھتے تو مسکراتے اور دوستانہ صلوات کے ساتھ فرماتے: ''جی بنا لیجیے تاج محل،خیالی تاج محل بنانے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے آپ لوگوں کے پاس۔''

وہ مجھے ڈانٹتے۔''ارے یار! آپ اس آدمی کے چکر میں کیوں رہتے ہیں؟ یہ آدمی کبھی زمین کی بات ہی نہیں کرتا، ہمیشہ آسمان کی سوچتا ہے۔''ہم لوگ مسکرا دیتے اور پھر ان کے مطابق زندہ دلی کے موضوعات پر گفتگو شروع ہو جاتی۔

مولانا غلام مصطفیٰ کی شخصیت کا فکری پہلو اپنی جگہ مسلم، لیکن اس کا دینی و اخلاقی پہلو بھی کم دل آویز نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی والدہ کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ صاحب ترتیب نمازی ہیں۔ احسن العلماء ڈائننگ ہال شروع ہونے سے قبل مطبخ سے دو طرح کا کھانا ملتا تھا، جینرل اور اسپیشل۔ اسپیشل کھانے میں دال کے ساتھ سبزی کا اضافہ ہوتا۔ یہ ان طلبہ کے لیے تھا جو اس کے لیے اسپیشل خوراکی دیتے۔ مولانا کی شان فقر یہ تھی کہ وہ خوراکی اسپیشل کھانے کی دیتے تاکہ ادارے کا فائدہ ہو اور کھانا جینرل لیتے، تاکہ غریب بچوں کو احساس نہ ہو۔ مولانا کو جو پیسے ان کے اخراجات کے لیے ملتے، وہ انہیں اپنے اوپر خرچ نہ کر کے بہت سے غریب طلبہ کی خفیہ کفالت پر صرف کرتے۔ مولانا ہوٹلوں کا چکر بھی کم لگاتے اور ناشتے بھی کم ہی کرتے۔ ویسے اگر کبھی ساتھ میں چلے گئے تو ہم لوگ فارغ ہو کر جلدی سے نکل آتے اور payment انہیں کرنا پڑتی، جس کے لیے وہ پیشگی تیار رہتے۔ وہ عارف اقبال جیسے دوستوں کو نصیحتیں کیا کرتے: ''ارے یار! تم لوگ یہاں سب کے سامنے بیٹھ کر اتنا کھاتے ہو، اشرفیہ کے ان بچوں کے بارے میں بھی سوچو جنہیں ہر دن معمولی ناشتہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔''

مولانا کی صحبت میں ہمیں اسلام کی آفاقی فکر کے ساتھ دینی اور انسانی قدروں سے بھی بڑی آشنائی ہوگئی۔

۲۶ جنوری ۲۰۰۱ء کو گجرات کے کچھ کے علاقوں میں شدید زلزلہ آیا، جس میں عام انسانوں کے ساتھ مسلمانوں کے بھی بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصانات ہوئے۔ اس پر تبصرے کے دوران اشرفیہ کے پاک صحن میں طلبہ کے درمیان یہ موضوع بھی زیر بحث آیا کہ مسلمانوں کے نام پر مرنے اور لٹنے والے سنی ہیں یا دیوبندی؟ اسی قسم کے سوالات اس وقت بھی سامنے آئے جب ۲۰۰۲ء میں گجرات جل رہا تھا اور خون مسلم سے ہولیاں کھیلی جارہی تھیں۔ مجھے ان سوالات سے نفرت ہونے لگی۔ پھر کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ جمعیۃ العلماء نے تباہ حالوں کے لیے وہاں نئی کالونیاں بنائی ہیں، جن میں بے گھروں کو گھر دیا گیا ہے۔ طلبہ میں پھر اس قسم کی باتیں ہونے لگیں: ''بتائیے پہلے ان کا مال گیا، اب ان کا دین بھی چلا جائے گا'' اور اس کے ساتھ ہی سنی قائدین پر صلوات بھی بھیجی جاتیں۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکا میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا سانحہ وقوع پذیر ہوا۔ دوسرے دن اخبارات کی ذیلی سرخی تھی: ''شک کی سوئی اسامہ پر''

مولانا عبدالحق صاحب نے یہ خبر کسی قدر فاتحانہ شان سے سنائی۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ معصوم انسانوں کی جان جائے، بے قصوروں کا اثاثہ تباہ ہو، اس سے قطع نظر کہ متعلقہ افراد مسلم ہوں یا غیر مسلم، اس پر خوشیاں منانا ایک غیر انسانی جذبہ ہے اور یہ غیر انسانی تعلیم اسلام کی تو نہیں ہوسکتی۔ اسلام تو دین سماحت ہے۔ دین رحمت ہے۔ تقریروں میں تو ہم یہی کہتے ہیں۔

اس کے کچھ دنوں بعد جب امریکا - طالبان جنگ شروع ہوئی، تو ہم لوگ نئی دنیا کے جذباتی تبصرے مستقل پڑھنے لگے تھے۔ بقول جاوید بھائی ایک ہفتے نئی دنیا پڑھ کر ایسا لگتا کہ اسلامی حکومت سٹھیاؤں تک پہنچ گئی ہے، اب بس مبارک پور پہنچنے والی ہے، پھر دوسرے ہفتے نئی دنیا پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا کہ اب جلد ہی دنیا سے اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ نئی دنیا کے ان غیر حقیقت پسندانہ تجزیوں سے جلد ہی اوب گئے اور اسے پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد جب طالبان کے پتے بکھر گئے اور طالبان کے ساتھ افغانستان بھی تباہ ہوگیا، تو افغانستان کی تباہی کے غم کے ساتھ یہ طفل تسلی بھی مل جاتی: ''چلو! طالبانی وہابی ہی تو تھے۔'' میں ایسی باتوں سے نفرت کرنے لگا تھا۔

انہی دنوں مراد ہوف مان اور مصطفیٰ محمد الطحان کی بعض تحریریں میری نظر سے گزریں جن میں نئی دنیا میں اسلام کے امکانات ومشکلات کے حوالے سے فکر انگیز باتیں تھیں۔ میں نے ان سب کے نتیجے میں یہ رائے قائم کی کہ ہمیں مسلک کو اتنا ہی عزیز رکھنا چاہیے اور اس کے لیے اسی حد تک کام کرنا چاہیے کہ اس سے دین اور امت کے لیے دشواریاں پیدا نہ ہوں۔ بہار ادب کی تحریری سرگرمیوں کے حوالے سے ۲۰۰۲ء تک مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب سے بھی اچھے تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ ایک بار بعد عشا ہم نے بہار ادب کے طلبہ کے سامنے مولانا کی گفتگو بھی کروائی تھی، جس میں انہوں نے تحریر وقلم کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ فن تحریر کے ضروری گوشوں پر گفتگو کی تھی۔ ان کی ملاقاتوں نے بھی میرا فکری گراف بہت بلند کیا۔ ان کی صحبتوں نے مجھے سوچنے کے بہت سے عنوانات دیے۔ ایک بار کہنے لگے: ''مخالف جماعتوں کے لٹریچر کا جواب ہمارے جلسے نہیں بنتے۔ لیٹریچر کا جواب لٹریچر سے ہی دیا جاسکتا ہے۔''

مولانا بولتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے:

''جس زمانے میں تحریک ندوہ شروع ہوئی، اعلیٰ حضرت کے ہم نواؤں میں یوپی اور بہار کی تمام بڑی خانقاہیں اور ارباب ثروت شخصیات تھیں۔ یہ سب لوگ تحریک ندوہ کے خلاف جلسے، پوسٹر اور کتاب میں لگ گئے، جب کہ تحریک کا جواب تحریک ہوتی ہے، تحریک کا جواب تقریر یا تصنیف نہیں ہوتی۔ یہ حضرات اس پوزیشن میں تھے کہ اگر یہ لوگ چاہتے تو ندوہ کے سامنے اس سے بڑا ادارہ قائم کر سکتے تھے۔ لیکن نہیں، ان کی آواز ندوہ بند کروانے کی تھی، ندوہ کے بالمقابل اس سے بڑا ندوہ شروع کرنے کے لیے سوچا ہی نہیں۔''

مولانا کی ان باتوں نے مجھے فکر کی اس پگڈنڈی پر ڈال دیا، جسے سنی بریلوی حلقے میں بزرگوں کی گستاخی اور فکری آزادی و بے راہ روی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

❁❁❁❁

پندرہواں منظر

عہد واثق

۲۰۰۳ء میں جب احقر جماعت سابعہ کا طالب علم تھا، استاذ گرامی مفتی بدر عالم مصباحی صاحب کا سری لنکا کا دورہ ہوا۔ انہیں اس سفر میں بعض ایسے تلخ تجربات ہوئے جن سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بریلوی فکر، انحراف کی راہوں سے گزر رہی ہے۔ ان کا میرے تعلق سے یہ حسن ظن تھا کہ میں ان کے مدعا کو اچھی طرح سمجھ اور لکھ سکوں گا۔ چنانچہ واپسی کے بعد انہوں نے مجھے بلوایا اور تفصیل سے اپنا سفر سنایا۔ اس سفر کا ایک اُعجوبہ وہ بھی تھا جسے میں نے اپنے مقالے میں یوں نقل کیا تھا:

''ایک ذمہ دار عالم دین اور مبلغ مفتی کے بارے میں سنا کہ جب وہ سری لنکا گئے تو وہاں انہیں عجیب وغریب شدت پسندی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بھی تقریر کرتے، اعلی حضرت کا نام لینا ضروری ہوتا۔ اگر اتفاق سے نہیں لیا تو تقریر کرنے کے بعد بعض حضرات سوال کر بیٹھتے کہ آپ نے اعلی حضرت کا نام کیوں نہیں لیا؟ آپ نے اعلیٰ حضرت کا شعر کیوں نہیں پڑھا؟ نماز جمعہ سے پہلے اعلیٰ حضرت کا لکھا ہوا خطبہ کیوں نہیں پڑھا؟ ایک صاحب جو نیم ملاّ تھے ایک دن آئے اور عرض کیا'' حضرت! مولانا الیاس قادری صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لفظ'' تم'' کا استعمال کیا ہے- وہ کہتے ہیں کہ ع.....تم پہ لاکھوں درود، تم پہ لاکھوں سلام- لہٰذا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہے- مفتی صاحب نے فوراً اعلی حضرت کے چند ایسے اشعار سنا دیے

جن کے اندر ''تم'' کا استعمال ہے۔ وہ صاحب خاموش ہو گئے۔ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ اس طرح کی باتوں سے میں تنگ آ گیا تھا۔ میں نے ایک روز تو یہاں تک کہہ دیا کہ تم لوگ جلد ہی نماز میں بھی اعلیٰ حضرت کا نام لینے کی فرمائش کرو گے۔'' (جام نور، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

انہی دنوں میں نے جہان رضا پاکستان میں سید فاروق القادری صاحب کا مضمون بھی پڑھا تھا، جس میں بریلوی فکر میں پیدا ہونے والے تشدد اور انحرافات پر نوحہ پڑھا گیا تھا اور اصلاحات کی کچھ ممکنہ تجاویز لکھی گئی تھیں۔ سید صاحب نے بتایا تھا کہ اعلیٰ حضرت کے نام لیواؤں نے اب اعلیٰ حضرت کے نام پر کون سا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ انہی دنوں سید محمد اشرف مارہروی کا ایک کتابچہ بھی میری نظر سے گزرا تھا جس میں انہوں نے سنی بریلوی مقررین اور مبلغین کی دعوت و تبلیغ کی ناکامی اور بے اثری کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ بتایا تھا کہ ہمارے واعظین، خطبا اور ثنا خوانوں کا رویہ کس طرح دین بیزار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ دیر صبح تک سونے والے واعظ کی باتیں کبھی بھی موثر نہیں ہو سکتیں۔

مفتی صاحب نے سری لنکا کی روداد سفر سنانے کے ساتھ مجھے یہ حکم فرمایا کہ میں بریلوی فکر میں پیدا شدہ جدید انحرافات پر لکھوں۔ مولانا مبارک صاحب نے بھی اس کی بھرپور تائید کی۔ میں نے اس کے بعد ایک طویل مضمون لکھا، جسے دیکھ کر مفتی بدر عالم صاحب اور مولانا مبارک صاحب عش عش کر اٹھے۔ شاید میں نے ان دونوں کا مدعا احسن طریقے پر سپرد قلم کر دیا تھا۔ مولانا مبارک صاحب کا حکم ہوا: ''اسے خوشتر کو بھیجو اور جام نور میں چھپواؤ۔''

''بہار ادب'' کے واسطے سے ہی حضرت مولانا عبدالمبین نعمانی صاحب سے بھی میرے رابطے استوار ہوئے تھے۔ وہ اشرفیہ کے بجائے المجمع الاسلامی میں رہا کرتے تھے۔ عصر بعد ہمارے بہت سے ساتھی ان سے استفادے کے لیے جاتے۔ میں بھی اپنا مقالہ لے کر ان کی خدمت میں پہنچا۔ حضرت نے بھی بہت پسند کیا۔ ایک دو جگہ معمولی قلم رکھا۔ اب تک وہ تحریر بلا عنوان تھی، خود اپنے ہی قلم سے یہ عنوان لگایا: ''دعوت و تبلیغ کی راہیں مسدود کیوں؟'' اتفاق سے خوشتر صاحب بروقت اس کی اشاعت نہ کر سکے۔ تین سال بعد جام نور کے اکتوبر اور نومبر

۲۰۰۷ء کے شماروں میں جب یہ مقالہ چھپا تو بقول مولانا مقبول احمد مصباحی، بریلی میں اس سال اعلیٰ حضرت کے عرس کے بجائے، جیتے جی خوشتر اور ذیشان کا عرس منایا گیا۔ اس کی اشاعت سے قبل متعدد بار مولانا مبارک صاحب پوچھ چکے تھے کہ اب تک وہ تحریر کیوں نہیں چھپی؟ خوشتر صاحب بھی بڑے فنکار ہیں۔ وہ کبھی اکیلے ڈوبنا نہیں چاہتے۔ اس لیے انہوں نے اس مقالے کے شروع میں مجھ سے یہ چند سطریں لکھوائیں:

''زیر نظر مضمون الجامعۃ الاشرفیہ میں سال فضیلت (۲۰۰۴ء) میں مفتی بدر عالم مصباحی صاحب کی تحریک پر سپرد قلم کیا گیا تھا، اسے مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب نے بھی ملاحظہ کیا اور پسندیدگی کے بعد دونوں حضرات نے اشاعت کے لیے اسے جام نور میں ارسال کرنے کا مشورہ دیا، بعد ازاں حضرت مولانا عبد المبین نعمانی صاحب سے اصلاح لینے اور عنوان منتخب کرانے کے بعد جام نور کو ارسال کر دیا، لیکن بوجوہ اب تین سال بعد اس کی اشاعت کی نوبت آرہی ہے، ہمیں امید ہے کہ قارئین اس تنقیدی مضمون کے تعمیری اور مثبت پہلوؤں سے مستفید ہوں گے۔ ذیشان مصباحی''

خوشتر صاحب نے یہ چند سطریں مجھ سے کیوں لکھوائیں، یہ بات مجھے اس وقت سمجھ میں آئی، جب مقالے کی اشاعت کے بعد یہ حضرات اس اچھے مقالے کے شروع میں اپنا نام دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے مجھ سے شاکی نظر آئے۔ دراصل مصلحت اور بزدلی کی سرحدیں باہم ایسی پیوست ہیں کہ بسا اوقات ہم جیسے سادہ لوح کے لیے ان میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بہر کیف! اس مضمون کی اشاعت کے بعد اوائل مارچ ۲۰۰۸ء میں جب عرس رضوی کے اندر ذیشان اور خوشتر جیسے باغیان مسلک اعلیٰ حضرت کے خلاف گلا پھاڑ تقریریں ہو رہی تھیں، وہاں مولانا مبارک صاحب بھی پہنچے اور تحفظ مسلک اعلیٰ حضرت کی کیسٹ بجا کر آگئے۔ اس مقالے میں ایسا کیا تھا کہ اچانک سے مسلک اعلیٰ حضرت خطرے میں آ گیا تھا، تفصیلی طور پر سمجھنے کے لیے تو پورا مقالہ پڑھنا چاہیے، البتہ یہاں اس کے چند ذیلی عنوانات دیے جاتے ہیں:

(۱) اعلیٰ حضرت کا محدود تعارف (۲) اعلیٰ حضرت کی اصلاحی خدمات سے چشم پوشی (۳) اعلیٰ حضرت یا مفتی اعظم ہند سے فروعی مسائل میں اختلاف کو ناقابل معافی جرم تصور کرنا (۴) بے جا تشدد (۵) مرکزیت کی بحث (۶) مذہبی جلسوں کی حالت زار (۷) عصری تعلیم یافتہ طبقہ سے علیحدگی (۸) افہام وتفہیم سے گریز (۹) دعوت واصلاح کے شعبے سے بے توجہی (۱۰) علما اور خواص وعوام میں بدعملی (۱۱) اعلیٰ حضرت کے ہم عصر اور ان سے پہلے کے علما سے بے تعلقی (۱۲) فکری پسماندگی۔

اس تحریر کی اشاعت سے گویا ہم نے شہد کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ سید محمد اشرف مارہروی کا خوشتر صاحب کے پاس فون آیا: ''خوشتر میاں! آپ کی ساری باتیں اپنی جگہ، لیکن اعلیٰ حضرت کے خلاف کوئی لکھے، یہ بات ہم لوگوں کو پسند نہیں۔''

خوشتر صاحب نے سمجھ لیا کہ گاج کہاں کی ہے اور کہاں گر رہی ہے۔ دریافت کیا:

''حضور! آپ نے ذیشان صاحب کی تحریر پڑھ لی؟''

''نہیں، پڑھی تو نہیں ہے، لیکن اس تعلق سے اب تک کئی فون موصول ہو چکے ہیں۔''

''حضور! ایک بار آپ خود پڑھ لیں، پھر آپ کا جیسا حکم؟''

اشرف میاں نے میری تحریر پڑھی اور اس کے بعد خوشتر صاحب کو مکتوب لکھا، جس کا ایک جملہ یہ بھی تھا:

''عزیزم مولانا ذیشان احمد مصباحی کے مضمون میں کوئی بات مسلک اعلیٰ حضرت کے خلاف نہیں ہے، بلکہ معاملہ برعکس ہے۔'' (جام نور، جنوری ۲۰۰۸ء)

اشرفیہ کے تعلیمی نصاب میں ایک پیپر مطالعے کا ہوتا ہے۔ اس پیپر کی تدریس نہیں ہوتی، صرف امتحان ہوتا ہے۔ مطالعے میں ارباب اشرفیہ نے بہت سی مفید تاریخی وتربیتی کتابیں شامل کر رکھی ہیں۔ فضیلت کے سال مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کی کتاب ''سنی-دیوبندی اختلافات کا منصفانہ جائزہ'' مطالعے میں شامل تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اس کا زیادہ منصفانہ نام ''سنی-دیوبندی اختلافات'' کی جگہ ''بریلوی-دیوبندی اختلافات'' ہونا چاہیے؛ کیوں کہ سنیت کے دعویدار تو دونوں ہیں، حقیقت میں سنی کون ہے، اس فیصلے کا حق تو منصفانہ جائزہ پڑھنے کے بعد قاری کو ملنا چاہیے۔ یہاں تو عنوان ہی میں فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔

مفتی صاحب نے شروع ہی میں اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ عرس فاتحہ اور میلاد و قوالی جیسے امور؛ سنی-دیوبندی اختلافات کی بنیاد نہیں ہیں، جیسا کہ عوام یہی سمجھتے ہیں۔ سنی-دیوبندی اختلافات کی اصل بنیاد، دراصل علماے دیوبند کی وہ کفری عبارتیں ہیں جو ناقابل تاویل ہیں۔ پوری کتاب اسی نقطے پر گردش کرتی ہے۔ دیوبندی علما نے جو تاویلات کی ہیں، مفتی صاحب نے تفصیل و تحقیق کے ساتھ ان تاویلات کے بخیے ادھیڑے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ متعدد مقامات پر میں خود کو مفتی صاحب کے ساتھ متفق نہیں کر پایا۔

''سنی-دیوبندی اختلافات کا منصفانہ جائزہ'' کے اندر میرے لیے سب سے نازک مقام وہ تھا جہاں مولانا قاسم نانوتوی کو منکر ختم نبوت ثابت کیا گیا ہے۔ تحذیر الناس میں خاتم النبیین پر جو گفتگو کی گئی ہے، اس کی روشنی میں ختم نبوت کے دو معنی سمجھ میں آتے ہیں۔

۱۔آخری نبی ۲۔بالذات نبی

جو معنی متواتر اور معروف ہے، وہ پہلا معنی ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی نے مزید ایک نئے معنی کا اضافہ کیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ معنی آفرینی حکیم ترمذی (۳۲۰ھ) نے بھی اپنے زمانے میں فرمائی تھی۔(۱)

اول نظر میں ایسا وہم گزرتا ہے کہ مولانا نے خاتم النبیین کے متواتر معنی کا انکار کیا ہے، لیکن سیاق و سباق سے پوری کتاب پڑھیے تو اس کی صراحت ملتی ہے کہ وہ معنی اول کے منکر نہیں ہیں۔ البتہ ایک جگہ معنی ثانی-نبی بالذات-پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا نے یہ بات لکھی ہے کہ یہ معنی ایسا ہے کہ اگر بالفرض نبی کریم ﷺ کے بعد بھی کوئی نبی آتا ہے تو بھی خاتمیت محمدی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مولانا کی یہ عبارت بظاہر کافرانہ ہے، لیکن غور کیجیے تو پتہ چلتا

---

(۱) حکیم ترمذی کی اصل عبارت یہ ہے: فإن الذي عمي عن خبر هذا، يظن أن 'خاتم النبيين' تأويله أنه آخرهم مبعثاً. فأي منقبة في هذا؟ وأي علم في هذا؟ تأويل البله الجهلة! (خاتم الاولیاء، ص:۳۱) اور مولانا قاسم نانوتوی (۱۸۸۰ء) کے الفاظ یہ ہیں: ''عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلعم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانے کے بعد اور آپ سب میں آخر نبی ہیں، مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم یا تاخر زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔'' (تحذیر الناس، ابتدائی سطور) ایسا لگتا ہے کہ مولانا قاسم نانوتوی کی عبارت بعینہ حکیم ترمذی کی مذکورہ عبارت کا ترجمہ یا خلاصہ ہے۔

ہے کہ مولانا کی گفتگو معنی ثانی - نبی بالذات - کے لحاظ سے ہے۔ اب یہ بات اپنے ظاہر کے لحاظ سے تو کافرانہ ہے، لیکن اس خاص تناظر کو سامنے رکھیے تو تصویر دوسری نظر آتی ہے۔ لیکن اب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ ایسی صورت میں معنی اول - آخری نبی - کے لحاظ سے خاتمیت محمدی پر فرق پڑتا ہے یا نہیں؟ مولانا قاسم نانوتوی نے اس جگہ اس کی صاف وضاحت نہیں کی ہے، اس لیے کفری معنی کا احتمال باقی رہتا ہے، لیکن یہ معنی ان کی مراد بھی ہو، یہ واضح نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف دوسری جگہ انہوں نے صراحت کی ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت زمانی، یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے کے قائل ہیں۔

تحذیر الناس میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ مولانا نانوتوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی مانتے ہیں اور نہ صرف مانتے ہیں بلکہ اس کے منکر کو کافر بھی جانتے ہیں۔ اپنے اس موقف پر انہوں نے آیت خاتم، حدیث رسول اور اجماع امت سے استدلال کیا ہے۔ البتہ آیت خاتم سے استدلال کے بارے میں کہا ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ اسے ختم مرتبی پر محمول کیا جائے جس سے ختم زمانی بھی - بطور دلالت التزامی - لازم آجاتا ہے، یا عموم مجاز کے طریقے پر خاتم کو مطلق رکھا جائے جس سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ختم مرتبی اور ختم زمانی دونوں ثابت ہوجاتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

۱- ''بلکہ بنائے خاتمیت اور بات پر ہے [نبوت بالذات/ خاتمیت مرتبی پر] جس سے تاخر زمانی اور سد باب مذکور [سد باب مدعیان نبوت] خود بخود لازم آجاتا ہے۔'' (تحذیر الناس، ص: ۴، کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند)

۲- ''ہاں! اگر بطور اطلاق یا عموم مجاز، اس خاتمیت کو زمانی اور مرتبی سے عام لے لیجیے تو پھر دونوں طرح کا ختم مراد ہوگا، پر ایک مراد ہو تو شایان شان محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتمیت مرتبی ہے، نہ زمانی۔'' (ص: ۸)

۳- ''سو اگر اطلاق اور عموم ہے تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے، ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالت التزامی ضرور ثابت ہے۔ ادھر تصریحات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مثل **انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی او کما قال**، جو بہ ظاہر بہ طرز مذکور اسی لفظ **خاتم النبیین** سے ماخوذ ہے، اس باب میں کافی

ہے۔ کیوں کہ یہ مضمون درجہ تواتر کو پہنچ گیا ہے، پھر اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا، گو الفاظ مذکور بسند متواتر منقول نہ ہوں، سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی، یہاں ایسا ہی ہوگا جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و وتر وغیرہ، باوجود یکہ الفاظ احادیث مشعر تعداد رکعات متواتر نہیں، جیسا اس کا منکر کافر ہے، ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا۔'' (ص:۹، ۱۰)(۱)

المختصر! خاتم النبیین بمعنی آخری نبی کا انہوں نے انکار نہیں کیا ہے، بلکہ اقرار کیا ہے، ہاں! ان کی بعض تعبیرات مثلاً اسے ''عوام کا خیال'' کہنے سے یہ وہم ضرور گزرتا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین بمعنی آخری نبی کے منکر ہیں، لیکن کسی اہل قبلہ کے حق میں کفری معنی کے وہم وشبہہ کی بنیاد پر اس کی تکفیر نہیں کی جاسکتی، جب تک وہ کھل کر اس کفری معنی کا اقرار نہیں کرتا۔

میں نے بہت سمجھنا چاہا کہ مولانا کی صراحت سے یہ بات سمجھ میں آجائے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین بمعنی آخری نبی نہیں مانتے، لیکن یہ معنی مجھ پر واضح نہ ہوا۔ میں نے اس مسئلے پر بعض احباب مثلاً صوفی غلام مدثر صاحب سے رات کے سناٹے میں گفتگو بھی کی۔ رات کے سناٹے میں اس لیے کہ ہمیں بتادیا گیا تھا کہ علماے دیوبند کے کفر میں جو شک کرتا ہے، وہ بھی کافر ہوجاتا ہے اور مجھے شک ہوگیا تھا اور کھلے بندوں اپنے شک کا اظہار اپنے کافر ہونے کا اشتہار کرنا تھا۔

صوفی غلام مدثر صاحب نے مجھے تحذیر الناس کی عبارتوں سے سمجھایا کہ دیکھیے اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی آتا ہے تو خاتمیت محمدی پر فرق نہیں پڑے گا۔ اس کے یہی تو معنی ہیں کہ رسول خاتم ہیں اور ان کے بعد بھی کوئی نبی آجائے تو وہ خاتم ہی رہیں گے۔ تو دراصل یہ رسول کے خاتم ہونے کا انکار ہے یا نہیں؟

---

(۱) اس مسئلے کی مزید وضاحت میں خود مولانا نانوتوی کی دو کتابیں مطبوع ہیں، مناظرۂ عجیبہ اور تنویر النبراس علی من انکر تحذیر الناس۔ ان کتابوں میں انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت زمانی کے منکر نہیں ہیں۔ اس حوالے سے ان کی ایک تیسری کتاب کا بھی ذکر ملتا ہے جو دستیاب نہیں ہے۔ ان شاء اللہ! اس قسم کے دیگر مباحث کا علمی وتاریخی تجزیہ راقم کی زیر تدوین کتاب ''تاریخ افتراق امت'' میں شامل ہوگی۔

میں نے عرض کیا کہ مولانا نانوتوی نے خاتم کے دو معنی بتائے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ آپ جس عبارت کو پیش کر رہے ہیں، اس میں انہوں نے کون سی خاتمیت مراد لی ہے؟ اگر ان کی مراد خاتمیت زمانی ہے تب تو آپ کی بات ٹھیک ہے، لیکن اگر مراد خاتمیت سے دوسرا معنی ہے، اس لحاظ سے تو واقعی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں! اس کے ساتھ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ خاتمیت زمانی پر بھی فرق نہیں آئے گا، یا یہ کہ اول متواتر معنی -ختم زمانی- کے لحاظ سے آپ خاتم نہیں ہیں، تب تو یقینی طور پر یہ التزام کفر ہوگا، لیکن یہ باتیں اتنی وضاحت سے وہاں ہیں کہاں؟ بلکہ اسی رسالے میں خاتمیت زمانی کا کھلا اظہار واقرار موجود ہے۔

بہر کیف! مجھے صوفی صاحب مطمئن نہ کر سکے اور میں اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہا، حتیٰ کہ اس کا امتحان بھی دے دیا اور اچھے نمبر سے پاس بھی ہو گیا۔ میرے شبہات کو اور بھی بڑھا دیا پیر کرم شاہ ازہری صاحب نے جن کو تحذیر الناس پہلی نظر میں فضائل رسالت مآب کا گنجینہ نظر آئی اور دوسری بار جب پڑھا تو ان پر اس کے معائب ونقائص کھلے، لیکن پھر بھی اتنے نہ کھلے کہ وہ کھل کر مولانا نانوتوی کو کافر کہتے۔ اتفاق سے ''تحذیر الناس میری نظر میں'' انہی دنوں المجمع الاسلامی میں میری نظر سے گزری اور میں نے اسے پڑھ ڈالا اور جتنا پڑھتا گیا اپنے سوالات کو اسی قدر پختہ پاتا گیا۔ افسوس کہ یار لوگوں نے پیر صاحب کا ایمان بھی ناپ دیا۔

۱۹/جولائی ۲۰۰۴ء کو ہماری دستار فضیلت تھی۔ حسب معمول ایک ماہ پہلے سے طلبہ اپنی دستار کی تیاریوں میں مصروف تھے اور میں اپنے چند احباب کے ساتھ دینی دعوت کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ میں مصروف تھا۔ ہفتہ دس دن قبل اپنے دوست ظفر الدین برکاتی کے ساتھ اس کی طباعت کے لیے دہلی چلا گیا۔ عرس حافظ ملت کے پہلے دن ۱۸/جولائی کی رات ہم دونوں کتابوں کا بنڈل ڈھوتے ہوئے اشرفیہ پہنچے۔ عزیزی ہاسٹل کے مغربی گیٹ پر سارے بنڈل اتارے۔ دونوں نڈھال تھے۔ سوچا احباب کو ہاتھ بٹانے کے لیے کہیں۔ اس وقت احباب کے جلوے تھے۔ نئے نئے ملبوسات زیب تن کیے سب دولہا بنے ٹہل رہے تھے۔ بہت چیخنے چلانے پر ان میں سے ایک دو ہم مزدوروں کی صف میں آئے۔

دوسرے دن کسی نے بتایا کہ حضرت مصباحی صاحب نے جبہ لینے کے لیے یاد کیا ہے۔ میں مصباحی صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو مصباحی صاحب حسب معمول پہلے مسکرائے اور پھر سامنے رکھے ہوئے رجسٹر کی طرف اشارہ کر دیا۔ رجسٹر کو دیکھا تو اوپر کچھ اس قسم کا مضمون لکھا ہوا تھا:

''میں مذہب حق اہل سنت و جماعت کا پابند ہوں اور ہر کفر وضلالت سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔ کتاب حفظ الایمان، تحذیر الناس اور براہین قاطعہ کی کفری عبارتوں کی بنا پر علمائے عرب وعجم نے مولوی اشرف علی تھانوی، مولوی محمد قاسم نانوتوی، مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی خلیل احمد انبیٹھوی کی جو تکفیر کی ہے، وہ بجا اور درست ہے۔ میں بھی مذکورہ افراد کی تکفیر اور حسام الحرمین کی مکمل تائید وتصدیق کرتا ہوں۔''(۱)

مذکورہ بالا مضمون کے نیچے تمام فارغ ہونے والے طلبہ کو دستخط کرنے تھے۔ میں جھجکا۔ چوں کہ ''سنی-دیوبندی اختلافات کا منصفانہ جائزہ'' پڑھ کر میرے ذہن میں ایسے سوالات اٹھ چکے تھے، جن کے پیش نظر میں ان علما میں سے بعض کی تکفیر پر مطمئن نہیں تھا۔ اب ہمارے سامنے دو میں سے صرف ایک آپشن تھا:

۱۔ اپنے دل ودماغ کا ساتھ دیتے ہوئے بعض ایسے اشخاص کی تکفیر سے اپنا قلم روک لیتا، جن کا کافر ہونا مجھ پر واضح نہیں تھا اور دستار فضیلت سے محروم ہو جاتا۔

۲۔ اپنے ضمیر کے خلاف، یکلخت تکفیر کی تائید کر دیتا اور جس حسین اور پر مسرت لمحے کے لیے اپنے ۶ رسال گزارے تھے، دستار فضیلت سے سرفراز ہو کر اس لمحے سے شاد کام ہوتا۔

---

(۱) یہ تحریر میں نے ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور، شمارہ نومبر ۲۰۱۳ء میں شائع مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب کے اداریے سے لی ہے۔ مولانا کے اداریے سے معلوم ہوتا ہے کہ اشرفیہ کا یہ دوسرا عہد واثق ہے جو ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۳ء تک رہا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا ۲۰۰۴ء اسی بیچ کا ہے، اس لیے ظن اغلب ہے کہ میرا دستخط اسی تحریر پر ہوا ہوگا۔ پہلا عہد واثق ۱۹۶۹ء سے ۲۰۰۱ء تک چلا، جب کہ ۲۰۱۳ء میں تیسرا عہد واثق تیار کیا گیا۔ واضح رہے کہ ان میں سے ہر آنے والا عہد پچھلے عہد سے زیادہ واضح اور سخت ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ماہ نامہ اشرفیہ کا مذکورہ بالا شمارہ۔

میں نے دوسرا آپشن اختیار کیا، دل و دماغ کی آواز کو ٹھکرایا اور دستخط کر دیا۔ کسی کی تکفیر ایسے بھی ہوتی ہے، شاید میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہ کرے۔ بعد میں مولانا مبارک حسین مصباحی صاحب کی ایک تحریر سے معلوم ہوا کہ ۹ /شعبان ۱۳۸۹ھ مطابق ۲۱ /اکتوبر ۱۹۶۹ء سے فارغین سے اعتقادی عہد واثق پر دستخط کرانے کا سلسلہ جاری ہے۔ حفظ، قرات، عالمیت، فضیلت اور تخصص کی سند دینے سے پہلے فارغین سے اس عہد واثق کو پڑھوایا جاتا تھا۔ اگر وہ بخوشی پڑھ کر دستخط کر دیتا تو اس کی سند جاری کی جاتی اور اگر کوئی طالب علم انکار کرتا، یا خاموشی اختیار کرتا تو اس کے معنی سند سے محرومی تھی۔ لیکن ۲۰۱۳ء سے جو تیسرا عہد واثق جاری ہے، یہ پہلے اور دوسرے عہد ناموں سے تقریباً چار گنا طویل، کل ۶ دفعات پر مشتمل ہے، اسے پڑھنا ہے، پھر اپنے قلم سے نقل کرنا ہے، پھر تصدیق کرنی ہے اور بصورت اختلاف، اپنا اختلاف درج کرنا ہے۔

سوچیے حفظ وقرأت کے طلبہ پر اس عہد واثق کا نقل کرنا کتنا گراں گزرتا ہوگا۔ حفظ و قرأت کے طلبہ پوری عبارت نقل کر دینے کے بعد جس فاتحانہ شان سے مکمل تحقیق اور اعتماد کے ساتھ تصدیقی دستخط کرتے ہوں گے، اس کا صحیح لطف کوئی حافظ محض اور قاری مطلق ہی اٹھا سکتا ہے۔ تیسرے عہد واثق کا آخری پوائنٹ حسب ذیل ہے:

''میرا اعتقاد و عمل اگر میرے اس عہد و اقرار کے خلاف ثابت ہو تو میں اہل سنت سے خارج ہوں اور الجامعۃ الاشرفیہ کی کسی سند کا مستحق نہیں ہوں۔ اگر سند حاصل ہونے کے بعد میری مخالفت ظاہر ہو تو میری سند مسترد ہوگی۔''

(اشرفیہ، نومبر ۲۰۱۳ء)

میں اشرفیہ کے موجودہ ارباب حل وعقد کو اس جرأت پر مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے حسام الحرمین کی تصدیق کے حوالے سے اپنی ہزار سختی کے باوجود، شک یا انکار کی صورت میں **فَقَد کَفَر** کو **فَقَد ضَلَّ** سے بدل دیا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص حسام الحرمین کی تصدیق سے انکار کرتا ہے تو اگرچہ اسے وہ مصباحیت کی سند سے محروم کر دیں گے، مگر اب وہ ان کے نزدیک کافر نہیں ہوگا، بلکہ صرف ''اہل سنت سے خارج'' ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بریلوی جہان فکر میں یہ اپنے آپ میں بہت بڑا انقلاب ہے۔ اسے کہتے ہیں ''بھاگتے

بھوت کی لنگوٹی ہی بہت ہے۔'' میرے لیے یہ بات بھی خوش کن ہے کہ ۲۰۰۴ء والے عہدنامے میں تصدیق کے بعد انکار کی صورت میں منسوخیِ سند کا ذکر نہیں ہے۔

۱۹۶۹ء سے ۲۰۱۸ء تک پورے ۵۰ سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ آپ اشرفیہ کے فارغین- بشمول حفاظ وقرا- کے فہم کو داد دیجیے کہ سب نے علماے دیوبند کے کفر کو سمجھ لیا اور اس تکفیر پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اب تک ایسا ایک واقعہ بھی سننے میں نہیں آیا کہ کسی نے اس عہدنامے کو پڑھنے کے بعد تصدیق کرنے سے انکار کیا ہو یا خاموش رہا ہو، سوائے میرے، لیکن میں نے بھی چند ثانیے کے توقف کے بعد دستار فضیلت کی لالچ میں، اپنی رائے کو ذبح کرتے ہوئے، فوراً اپنی مہر تصدیق ثبت کردی۔ ویسے اس بات کا امکان اپنی جگہ موجود ہے کہ یقیناً اس کیفیت سے میری طرح بہت سے مصباحی دوچار ہوئے ہوں گے، لیکن میری ہی طرح ان میں سے کسی میں بھی انکار کی جرأت نہیں ہوئی ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ مسئلہ یہاں صرف اشرفیہ کی سند اور دستار کا نہیں، اگر بات یہیں تک ہوتی تو شاید کوئی انکار کی جرأت کی سوچ بھی سکتا تھا، لیکن یہاں تو اس سے آگے بڑھ کر اس سلاٹر ہاؤس سے اپنے ایمان کو بچانا ہے جو حسام الحرمین کے نام پر تیار کیا گیا ہے، کہ ذرا شک کیا اور کافر بنے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کل مورخ پر کیا بیتے گی جب وہ لکھے گا کہ ہندوستان میں ایک ایسا دینی ادارہ بھی تھا جہاں بعض علما کی تکفیر پر دستار وسند ملتی تھی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بصیرت افروز واقعہ نقل کردوں۔ ابھی سال گذشتہ (۲۰۱۷ء) جب میں نے دہلی میں نوجوان فضلا کی محفل میں، بزرگ مصباحی عالم، علامہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی صاحب سے، پیر کرم شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے، تحذیر الناس کے بارے میں ان کی ذاتی رائے جاننا چاہی تو انہوں نے مجھے حضرت ابوہریرہ کی یہ روایت سنادی کہ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ سے مجھے دو باتیں پہنچی ہیں؛ ایک بات وہ ہے، جس کو میں نے تم سے بیان کیا ہے اور دوسری بات وہ ہے، جس کا اگر اظہار کردوں تو تم میرا حلقوم کاٹ دوگے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر گفتگو کا رخ موڑ دیا:

''ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقامے دارد- گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی''

غور کیجیے، مفتی صاحب کی اس خاموشی میں بیان کی کتنی وسعت و پہنائی مضمر ہے!

اب آخر میں ایک عبرت انگیز لطیفہ سنیے۔غالباً ۲۰۱۷ء میں جامعہ ملیہ، نئی دہلی میں حضرت مفتی نظام الدین صاحب قبلہ کا ''تقلید واجتہاد'' پر خطاب ہوا، جسے بہت پسند کیا گیا۔لیکن کچھ دنوں بعد جب ماہ نامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی میں مفتی صاحب کا یہ فتویٰ شائع ہوا کہ دیوبندی کافر ہیں اور جو ان کو کافر نہ مانے وہ بھی کافر ہیں، تو اس کو لے کر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے اساتذہ نے بہت ہنگامہ کیا اور پروفیسر اختر الواسع پر دباؤ ڈالا کہ آئندہ ایسے لوگوں کو ہرگز جامعہ نہ بلایا جائے۔میری پی ایچ ڈی کے نگراں پروفیسر محمد اقتدار خان مجھ سے کہنے لگے کہ تم لوگ دیوبندیوں کو کافر کہو اور دیوبندی تم کو کافر کہیں۔تم لوگوں کی روزی روزی روٹی اسی سے جڑی ہوئی ہے۔لیکن ہمیں کیوں اس میں گھسیٹتے ہو، ہم تو رام پوری ہیں۔دارالافتا اشرفیہ کی تمام تر عظمت ورفعت کے اعتراف کے ساتھ عرض ہے کہ اس پہلو پر ذمہ داران کو غور کرنا چاہیے۔

❁❁❁❁

سولہواں منظر

فَقَد کَفَر؟

۱۹؍جولائی ۲۰۰۴ء مطابق یکم جمادی الاخریٰ ۱۴۲۵ھ کو عرس حافظ ملت کے نورانی ماحول میں ہماری دستار بندی ہوگئی۔ اسی موقع پر ''دینی دعوت'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ دینی دعوت کی اشاعت میں چوں کہ قصبہ مبارک پور کے بعض مخیرین کا تعاون بھی شامل تھا، اس لیے عرس کے چند دنوں بعد میں اپنے رفیق ظفر الدین برکاتی صاحب کے ساتھ دینی دعوت کے معاونین اور دیگر ارباب ذوق کو دینی دعوت تقسیم کرنے قصبہ مبارک پور پہنچا۔ ہم لوگ ڈاکٹر شمیم چیئرمین کے دفتر میں تھے۔ ان کو دینی دعوت نذر کی گئی اور پھر اس سے متعلق گفتگو ہونے لگی۔

''اگر ایک کتاب زائد ہو تو آپ حضرات میرے والد کو بھی دے دیں؟'' میرے بازو میں بیٹھے ایک ۴۰ / ۴۵ سالہ شخص نے گزارش کی۔

''آپ کون؟''

''میں علامہ ظفر ادیبی کا بیٹا ہوں۔''

گذشتہ ۶؍سالوں سے خاک مبارک پور سے ہم آغوش تھا اور مسلسل یہ نام سنتا رہا تھا، لیکن شخصیت کی زیارت سے آنکھیں محروم تھیں۔ دل نے کہا: ''موقع غنیمت ہے۔ چلو، آج یہ آرزو بھی بر آئی۔'' میں نے برکاتی صاحب کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر ایجابی تاثرات تھے۔

''جی! کہاں ہیں آپ کے والد؟''

''یہیں پاس ہی میں میرا گھر ہے۔''

مبارک پور کی پر پیچ گلیوں سے گزرتے ہوئے اگلے چند منٹ میں ہم علامہ ظفر ادیبی صاحب کے دولت کدے کے باہر تھے۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ بجلی کٹی ہوئی تھی۔ چراغ روشن تھے۔ ہمیں برآمدے میں بٹھایا گیا۔ اندر سے قوس نما ایک دبلی پتلی، ضعیف و نحیف، سفید پوش شخصیت نمودار ہوئی۔ روشنی مدھم تھی، اس لیے چہرے کے خط وخال نمایاں نہیں تھے۔ بس اتنا یاد ہے کہ قد کی طرح ہی، چہرہ بھی طویل ونحیف تھا۔ چائے آئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ گفتگو شروع کہاں سے ہوئی، یہ یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ بیچ میں دو تین بار شیخ ابن تیمیہ کا نام آیا اور ہر بار ادیبی صاحب نے التزام کے ساتھ علامہ ابن تیمیہ کہا۔ مجھے استاذ گرامی مولانا شمس الہدیٰ مصباحی کی بات یاد آئی کہ ایک دن جامع دمشق کے منبر پر ابن تیمیہ نے تقریر کی اور جب منبر سے نیچے اترا تو یہ کہتے ہوئے اترا: اللّٰہُ یَنزِلُ مِنَ العَرشِ کَنُزُولِی ھٰذا۔ یعنی جس طرح میں منبر سے اتر رہا ہوں، اسی طرح اللہ پاک عرش سے نزول فرماتا ہے۔ اس پر اہل مسجد بھڑک اٹھے اور ابن تیمیہ کی ہاتھوں، لاتوں، چپلوں اور ڈنڈوں سے پٹائی کی اور پیروں میں رسی باندھ کر گھسیٹا۔ میں نے جب علامہ ظفر ادیبی سے ابن تیمیہ کے حوالے سے یہ انداز تخاطب دیکھا تو فوراً یہ سوال کیا کہ آپ ابن تیمیہ کو از راہ احترام علامہ کہتے ہیں، جب کہ ابن تیمیہ کا یہ حال تھا۔ میں نے واقعہ مذکورہ بیان کر دیا۔

میری زبان سے یہ سوال ادا ہونا تھا کہ بڑے میاں کو جیسے کسی نے الیکٹرک شارٹ دے دیا ہو۔ اب تک جو کرسی سے چمٹ کر نڈھال بیٹھے تھے، اب ایک دم سے جوان ہو گئے اور سمٹ کر سیدھا بیٹھتے ہوئے گویا ہوئے: ''کس نے کہا؟ یہ جھوٹی بات ہے۔ یہ مشہور سیاح ابن بطوطہ کی بات ہے، جو جھوٹی ہے۔ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت ابن بطوطہ دمشق پہنچا ہے، اس وقت علامہ ابن تیمیہ دمشق میں تھے ہی نہیں۔ اب یا تو یہ واقعہ کسی اور کے ساتھ ہوا ہوگا اور ابن بطوطہ کو اشتباہ ہو گیا، اس نے ابن تیمیہ سمجھ لیا اور لکھ دیا، یا جان بوجھ کر اس نے جھوٹ بولا اور ایک بڑے عالم کو قصداً ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ اب صورت حال جو بھی ہو، لیکن واقعہ از روئے تاریخ غلط ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں ایک عام سیاح کی بات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔''

وقت غنیمت تھا۔ میں نے سوچا کہ پتہ نہیں دوبارہ ملاقات پھر ہو، نہ ہو۔ ایسے میں کیوں نہ کچھ ضروری باتیں پوچھ ہی لی جائیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ادیبی صاحب کے اشرفیہ

چھوڑنے کی وجہ حسام الحرمین کی تصدیق کا مسئلہ ہی تھا۔ ادیبی صاحب نے غالباً یہ کہہ کر حسام الحرمین کی مکمل تصدیق کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ''میں حرف بہ حرف تصدیق، قرآن کے سوا کسی بھی کتاب کی نہیں کرتا تو حسام الحرمین کی کیوں کرنے لگا؟'' میں نے دریافت کیا: ''حضور! علمائے دیوبند کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''علمائے دیوبند کے بارے میں میرا وہی موقف ہے جو اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔''

میں اس غیر متوقع جواب سے سنّ ہو کر رہ گیا۔ ''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے تمہید ایمان میں لکھا ہے کہ جب تک کسی کا کفر مجھ پر آفتاب نیم روز کی طرح روشن نہیں ہو جاتا، میں کسی کی تکفیر نہیں کرتا۔ یہی موقف میرا بھی ہے۔ علمائے دیوبند کی عبارتیں قابل گرفت ہیں، ان کے اندر کفری معنی نکلتے ہیں، انہیں ایسی عبارتیں نہیں لکھنی تھیں، لیکن اس کے باوجود علمائے دیوبند کا کفر مجھ پر آفتاب نیم روز کی طرح روشن نہیں ہوا۔ اس لیے میں ان کی تکفیر نہیں کرتا۔ میں تو اصولاً مسلک اعلیٰ حضرت کے ساتھ ہوں۔''

میری حیرت کافور ہوئی اور دل ہی دل میں بڑے میاں کے حسن جواب کی داد دینے لگا۔ لیکن سوال ابھی باقی تھا۔ ''لیکن علمائے دیوبند نے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کی ہے۔ مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھا ہے کہ حضور کا علم نعوذ باللہ! جانوروں اور پاگلوں کی طرح ہے اور یہ شان رسالت مآب میں کھلی توہین ہے۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟''

''نہیں! بات یہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مولانا سے سوال ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالم الغیب کہا جائے یا نہ کہا جائے؟ مولانا کا جواب نفی میں تھا۔(۱) اب اس کے لیے تفصیل کی اور

---

(۱) مولانا برکات احمد ٹونکی اور مولانا احمد رضا خان بریلوی بھی اس جواب میں مولانا تھانوی کے شریک ہیں۔ دونوں کے حوالے بالترتیب حسب ذیل ہیں:

''عالم الغیب بلا قید کہنا سوائے جناب باری کے صحیح نہ ہوگا۔'' (فصل الخطاب فی العلم بما غاب، ص: ۱۳، ۱۵)

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم قطعاً بے شمار غیوب و ما کان و ما یکون کے عالم ہیں مگر عالم الغیب صرف اللہ عزوجل کو کہا جائے گا۔ جس طرح حضور اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قطعاً عزت جلالت والے ہیں۔ تمام عالم میں ان کی برابر کوئی عزیز و جلیل ہے نہ ہو سکتا ہے۔ مگر محمد عزوجل کہنا جائز نہیں۔'' (فتاویٰ رضویہ، ۲۹/ ۴۰۵)

کہا کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے، نبی کریم ﷺ کے لیے اس کا استعمال درست نہیں ہے۔ اور کیوں درست نہیں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ زید اگر نبی کریم ﷺ کو عالم الغیب کہتا ہے تو دریافت طلب یہ امر ہوگا کہ نبی کریم ﷺ اگر غیب جانتے ہیں تو دو حال سے خالی نہیں، یا تو کل علوم غیبیہ جانتے ہوں گے یا بعض علوم غیبیہ۔ پہلی شق عقلاً اور نقلاً باطل ہے۔ اور اگر بعض علوم غیبیہ جانتے تھے تو ایسا علم تو ہر صبی و مجنوں، بلکہ جملہ بہائم کو بھی حاصل ہے۔

اب یہاں قابل غور لفظ ایسا ہے۔ اگر ایسا سے مولانا اشرف علی تھانوی کی مراد علم رسالت مآب ﷺ ہے، تو یقیناً یہ گستاخی اور کفر ہے۔ لیکن لفظ ایسا کا اشارہ یہاں ایک دوسرے لفظ کی طرف بھی ممکن ہے اور وہ ہے بعض علوم غیبیہ، جو سابق میں گزر چکا ہے۔ اب اگر ایسا سے مراد بعض علوم غیبیہ ہو تو جملہ یوں بنے گا: ''زید اگر نبی کریم ﷺ کو عالم الغیب کہتا ہے تو دریافت طلب یہ امر ہوگا کہ نبی کریم ﷺ اگر غیب جانتے ہیں تو دو حال سے خالی نہیں، یا تو کل علوم غیبیہ جانتے ہوں گے یا بعض علوم غیبیہ۔ پہلی شق عقلاً اور نقلاً باطل ہے۔ اور اگر بعض علوم غیبیہ جانتے تھے تو بعض علوم غیبیہ تو ہر صبی و مجنوں، بلکہ جملہ بہائم کو بھی حاصل ہے۔''

اس صورت میں یہ عبارت کفری نہ رہی۔ پھر بھی میں ایسی عبارت کی مذمت کرتا ہوں۔ مولانا نے ایسی عبارت لکھی ہی کیوں جس میں ایک احتمال اہانت اور کفر کا بھی نکلتا ہے، لیکن اس کے باوجود میں تکفیر نہیں کرتا، کیوں کہ تاویل کا ایک پہلو موجود ہے، لہٰذا یہ کفر میرے نزدیک آفتاب نیم روز کی طرح روشن نہیں ہوا۔''

بعد میں جب مولانا تھانوی کا فتویٰ **تغییر العنوان** میری نظر سے گزرا، جس میں لوگوں کے مطالبے پر انہوں نے اپنی عبارت کو بدل دیا ہے اور اپنے موقف کی تائید اور اپنی بدلی ہوئی عبارت کی تمثیل کے لیے شرح مواقف کا حوالہ دیا ہے، تو میری حیرتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ **تغییر العنوان** میں مولانا تھانوی نے لکھا ہے:

> ''اب حفظ الایمان کی اس عبارت کو جو کہ اسی سوال کے بالکل شروع میں مذکور ہے، اس طرح پڑھا جاوے: ''اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں، تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا تخصیص ہے، مطلق بعض علوم غیبیہ تو غیر انبیاء علیہم السلام کو بھی حاصل ہیں، تو چاہئے کہ سب کو عالم الغیب کہا جاوے۔

اور ایسی عبارت بعینہا شرح مواقف کے موقف سادس کے مرصد اول کے مقصد اول میں فلاسفہ کے جواب میں ہے: **والبعض ای الاطلاع علی البعض لایختص بہ ای بالنبی** ۔بعض مغیبات پر اطلاع نبی کے ساتھ مختص نہیں۔

اور اسی کی مثل مطالع الانظار شرح طوالع الانوار للبیضاوی رحمہ اللہ میں ہے: **وان ارادوا بہ الاطلاع علی بعضہا فلایکون ذالک خاصۃ للنبی، اذما من احد الا ویجوز ان یطلع علی بعض الغائبات**۔ اور اگر اس سے ان کی مراد بعض مغیبات پر اطلاع ہے تو یہ نبی کا خاصہ نہیں ہے کیونکہ بعض مغیبات پر مطلع ہونا ہر شخص کے لیے ممکن ہے۔

یہ دونوں عبارتیں بسط البنان اور اس کے منہیہ [حاشیۂ مصنف] میں مذکور ہیں۔ اب اگر اس پر بھی کلام ہو تو میں پھر بدلنے کو تیار ہوں۔ مگر شرح مواقف و مطالع الانظار کی عبارت بدلنے کے بعد۔''

افسوس کہ مولانا تھانوی کی یہ تحریر و تغییر، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی وفات ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ کے دو سال بعد ۱۸ صفر ۱۳۴۲ھ کی ہے۔ کاش یہ تحریر ان کی حیات میں آ گئی ہوتی تو شاید مسئلے کا تصفیہ نکل جاتا۔

دوران گفتگو مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کا ذکر آیا۔ علامہ ادیبی کہنے لگے:

''مفتی صاحب بھی عجیب آدمی تھے۔ اشرفیہ سے نکلنے کے بعد بھی میرے رابطے ان سے بہت اچھے تھے۔ جب بھی میں عرس کے موقع پر جاتا، انہی کے کمرے میں ٹھہرتا۔ یہ تو ۱۹۹۲ء کی بات ہے۔ میں نے کملی کے مسئلے میں ان کے خلاف کیا لکھ دیا، میرے پرانے دفتر دوبارہ کھولے جانے لگے۔''

میں نے سنا تھا کہ علامہ ادیبی کی بعض رشتہ داریاں وہابی اور دیوبندی گھرانوں میں بھی تھیں۔ اس تعلق سے جب میں نے ذکر چھیڑا تو کہنے لگے کہ اس زمانے میں اس سے کون بچا ہے۔ بطور مثال اشرفیہ کے بعض نمایاں لوگوں کا نام لے کر بتایا کہ فلاں صاحب کی بیٹی ابھی کچھ دنوں قبل ایک دیوبندی سے بیاہی گئی ہے۔

''میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔''

باتیں اور بھی تھیں، لیکن ایک ضعیف آدمی کو اب اس سے زیادہ پریشان کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اجازت لی اور چلتا بنا۔

یادش بخیر! علامہ ظفر ادیبی کی بات آ ہی گئی تو اب ان کے ایک ممتاز شاگرد کا قصہ بھی سنیے جو کسی قدر اسی کیس سے متعلق ہے۔ علامہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی مصباحی نے متعدد بار بیان فرمایا کہ علامہ ظفر ادیبی میرے مشفق استاذ تھے۔ اس لیے ان کی حیات میں جب بھی مبارک پور جاتا، تو ان سے ملنے ضرور جاتا۔ اس پر بعض اساتذہ اشرفیہ معترض بھی ہوتے، تو میں ان کو جواب دیتا۔

مفتی صاحب نے بتایا کہ علامہ فضل حق نے اسماعیل دہلوی کی تکفیر کی اور **من شک فی کفرہ و عذابہ فقد کفر** کا حکم لگایا۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے علماے دیوبند کی تکفیر کی اور ان پر بھی یہی حکم لگایا۔ اب علماے دیوبند کے کفر میں جو شک کرتا ہے، اسے **من شک فی کفرہ و عذابہ فقد کفر** کا حوالہ دے کر فوراً کافر بنانے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے، جب کہ خود اعلیٰ حضرت، اسماعیل دہلوی کے کفر میں شک اور تامل کرتے ہیں۔ اس ضابطے کے عموم کو اگر بلا قید و شرط مان لیا جائے تو علامہ فضل حق کے فتوے کی روشنی میں اعلی حضرت خود بھی **من شک فی کفرہ و عذابہ فقد کفر** کی زد میں آتے ہیں، بلکہ اپنے فتوے کی زد میں آتے ہیں؛ کیوں کہ جن ایام میں وہ علماے دیوبند کے کفر کی تحقیق کر رہے تھے، تو تحقیق حق سے قبل علماے دیوبند کے کفر کے حوالے سے وہ بھی شک میں تھے۔ حسام الحرمین کے **من شک فی کفرہ و عذابہ فقد کفر** کے عموم مطلق کے خلاف یہ بہت مضبوط شبہہ ہے، جسے سب سے پہلے میں نے ہی پیش کیا تھا، جس کا قصہ کچھ یوں ہے:

''میں ابھی نو فارغ تھا۔ جامعہ حمیدیہ بنارس میں پڑھاتا تھا۔ چوری چورا اکسپریس سے گورکھ پور سے بنارس کے لیے آ رہا تھا۔ اتفاق سے اسی ٹرین میں علامہ مشتاق نظامی بھی بیٹھے ہوئے تھے، جو الہ آباد جا رہے تھے۔ میں نے ان کے سامنے مذکورہ شبہہ رکھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے: مولانا! آپ کا یہ سوال بہت اہم ہے۔ آپ ایسا کریں۔ الجامعۃ الاشرفیہ کا سنگ بنیاد پڑنے والا ہے۔ وہاں تمام اکابر علماے اہل سنت تشریف لا رہے ہیں۔ میں بھی حاضر ہوں گا۔ آپ وہاں تشریف لائیے اور وہیں اکابر کے سامنے اپنا سوال رکھیے۔

۱۹۷۲ء میں اشرفیہ کے سنگ بنیاد کے موقع پر حاضر ہوا۔ بہت سے اکابر علما جلوہ افروز تھے۔ میں خدمت میں تھا۔ موقع پاتے ہی میں نے اپنا سوال رکھ دیا۔ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ جب خاموشی ذرا طویل ہوئی تو فوراً علامہ ارشد القادری گویا ہوئے: ارے مولانا! آپ کا سوال بہت سنجیدہ اور علمی ہے اور ابھی علماے کرام ایک دوسرے مقصد کے لیے جمع ہیں۔ اس بیچ آپ نے یہ بحث چھیڑ دی۔ آپ ایسا کریں کہ آپ کا جو بھی سوال ہے، اسے قلم بند کر دیں اور نیچے اپنا نام پتہ لکھ کر حضرات مشائخ کے سپرد کر دیں۔ یہ حضرات جب واپس اپنے ٹھکانوں پر جائیں گے تو وہاں اطمینان سے آپ کے سوال کا جواب لکھ کر آپ کو بھیج دیں گے۔

میں نے اپنا سوال مرتب کیا، کاربن کی مدد سے اس کی کئی کاپیاں تیار کیں اور تمام علماے کرام کے حوالے کر دیا۔ بات آئی گئی ختم ہوگئی۔ اس کے دو سال بعد مجھے اشرف العلماء نے بنارس سے دار العلوم محمدیہ، ممبئی بلا لیا۔ میرے بارے میں انہی دنوں اس قسم کی چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں کہ مفتی صاحب رضوی نہیں ہیں، رشیدی ہیں، اس لیے اعلیٰ حضرت سے وہ عقیدت نہیں رکھتے جو رکھنی چاہیے، بلکہ گاہے بگاہے اعلیٰ حضرت کی تحریروں پر سوال بھی اٹھاتے رہتے ہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ایک طبقہ دار العلوم محمدیہ میں میری تقرری پر چیں بجبیں تھا۔ اشرف العلماء نے ایسے لوگوں کی زبان بندی کے لیے سہ ماہی امتحان رکھا اور ممتحن کے طور پر سید العلماء اور مجاہد ملت کو بلوایا۔ ان حضرات کے حوالے بیشتر انہی کتابوں کا امتحان رکھا، جن کو میں پڑھاتا تھا۔ یہ حضرات طلبہ کی علمی استعداد اور ان کے جوابات سے بہت خوش ہوئے۔ اس کا بالواسطہ کریڈٹ مجھے بھی ملا۔

مجاہد ملت جب رخصت ہو رہے تھے، اچانک ان کی نظر میرے اوپر اٹک گئی۔

مولانا! اشرفیہ کے سنگ بنیاد کے موقع پر سوالات آپ نے ہی پیش کیے تھے؟

جی حضور!

اچھا! کسی کا جواب آیا۔

حضور! اب تک کسی کا کوئی جواب نہیں آیا۔

اچھا! آپ ایسا کریں کہ شام میں میری قیام گاہ پر تشریف لائیں۔ مجاہد ملت نے یہ کہا اور روانہ ہو گئے۔

شام کے وقت میں مجاہد ملت کی قیام گاہ پر پہنچا۔ مجاہد ملت نے تخلیہ فرمایا۔ اس کے بعد استفسار کیا:

مولانا! اب تک آپ کے پاس کسی کا کوئی جواب نہیں آیا۔ لیکن چوں کہ سوال پر مسئول غور کرے یا نہ کرے، سائل تو خود مسلسل غور کرتا رہتا ہے۔ تو اس طویل مدت میں آپ نے بھی تو کچھ غور کیا ہوگا؟

جی حضور! میں نے غور کیا ہے اس پر۔

کیا جواب سمجھ میں آیا؟

''حضور! **من شک فی کفرہ و عذابہ فقد کفر** کے معنی یہ ہیں کہ اطلاع شرعی کے بعد اگر کوئی شک کرے تو یقیناً وہ کافر ہے۔ اور اطلاع شرعی کے معنی یہ ہیں کہ یہ عبارتیں اس تک پہنچی ہوں اور اس کے بعد ان سے اس کے اوپر کفر واضح بھی ہوا ہو۔''

مجاہد ملت یہ جواب سن کر کھل اٹھے اور فرط مسرت میں مجھے گلے لگا لیا۔ فرمایا:

''مولانا! یہی جواب ہے۔''

بعد میں جب راقم السطور نے مفتی مطیع الرحمٰن رضوی مضطر کی معرکہ آرا کتاب ''اہل قبلہ کی تکفیر'' پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ ممکن ہے کہ ایک ہی کفر کسی کے نزدیک کلامی والتزامی ہو اور کسی کے نزدیک فقہی ولزومی ہو، ایسی صورت میں جس کے نزدیک کفر کلامی والتزامی ہوگا، وہ قطعاً تکفیر کرے گا اور جس کے نزدیک کفر فقہی ولزومی ہوگا، وہ تکفیر نہیں کرے گا۔ مفتی صاحب نے اس کی متعدد صورتیں بھی بیان کر دی ہیں۔

پھر ایک مقام پر **من شک فی کفرہ و عذابہ فقد کفر** کی حسب ذیل توجیہ فرمائی ہے:

''**من شک فی کفرہ و عذابہ فقد کفر** میں ہٖ ضمیر کا مرجع ''منکر ضروریات دین'' ہے تو معنی یہ ہوئے کہ **من شک فی کفر منکر ضروریات الدین و عذابہ فقد کفر** اور جس کے نزدیک ''منکر ضروریات دین ہونا''، ''بداہۃً متحقق نہ ہوا''، وہ اگر شک کرتا ہے تو دراصل وہ **من شک فی کفرہ و عذابہ** کا مصداق ہی نہیں، اس لیے مَن کا عموم اس کو شامل نہیں۔'' (ص:۶۹)

قابل ذکر ہے کہ مفتی مطیع الرحمٰن صاحب جب خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں تشریف لائے تھے تو ان سے مولانا غلام مصطفیٰ ازہری صاحب نے اپنے قیام ازہر کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کیا:

''قاہرہ کے ڈاکٹر محمد عبدالقادر نصار کو مکتبۃ الحقیقۃ، ترکی سے مطبوعہ اعلیٰ حضرت کی معروف کتاب **الدولۃ المکیہ** ملی۔ پڑھ کر اعلیٰ حضرت کے علم وفضل کے قائل ہوئے۔ لیکن چوں کہ طباعت اچھی نہیں تھی، اس لیے اس کی تحقیق جدید کے ساتھ اس کو از سر نو شائع کرنے کے درپے ہوئے۔ پھر سری لنکا کے ایک طالب علم کے ساتھ ان کا رابطہ ہوا اور اس کے واسطے سے ہندوستانی طلبہ ان کے رابطے میں آئے۔ ڈاکٹر موصوف کو بعض مقامات کی تحقیق کے لیے دوسرے نسخے کی حاجت تھی، اس لیے انہیں دوسرا نسخہ فراہم کیا گیا۔ آخر میں انہوں نے اس پر ایک مقدمہ لکھا، جس میں انہوں نے لکھا کہ اعلیٰ حضرت دیوبندی جماعت کو وہابی کہتے ہیں، جب کہ دیوبندی، اہل سنت وجماعت ہی ہیں اور ان کا اختلاف بعض فروعی مسائل میں ہے۔ ہندوستانی طلبہ نے ڈاکٹر صاحب سے احتجاج کیا اور حسام الحرمین اور دیگر کتابیں ان کی خدمت میں پیش کیں۔ اس کے بعد بھی انہوں نے علمائے دیوبند کی تکفیر نہیں کی، البتہ اپنے مقدمے میں معمولی ترمیم کی اور لکھا کہ دیوبندی چند نمایاں مسائل میں وہابیہ سے مختلف ہیں۔ مثلاً:

۱۔ وہابیہ کے برخلاف، وہ اہل سنت کے اشعری ماتریدی طریقے پر ہیں۔

۲۔ وہابیہ کے برخلاف، وہ اہل تصوف ہیں اور چشتی، قادری، نقش بندی وسہروردی سلاسل سے منسوب ہیں۔

۳۔ وہابیہ کے برخلاف، وہ فقہ میں مذہب حنفی کے پیروکار ہیں۔

البتہ استغاثہ اور قیام ومیلاد جیسے مسائل میں وہ وہابیہ کے ہم خیال ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقادر نصار کی تحقیق وتقدیم کے ساتھ الدولۃ المکیۃ ۲۰۰۶ء میں دارۃ الکرز، مصر سے شائع ہوگئی۔''

یہ پورا واقعہ سنانے کے بعد مولانا غلام مصطفیٰ صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے پوچھا کہ مذکورہ ڈاکٹر پر اب کیا حکم لگے گا؟ تو مفتی صاحب کا سادہ جواب تھا:

''ان پر کوئی حکم نہیں لگے گا، جب تک ان کفریات پر کسی کا انشراح صدر نہیں ہو جاتا، اس پر تکفیر واجب نہیں ہوگی۔''

کئی سال ہوئے، راقم السطور نے ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کی ایک تقریر سنی تھی، جس کے آخر میں انہوں نے ایک سوال کے جواب میں مختلف لفظوں میں تقریباً وہی بات کہی تھی جو بات مفتی صاحب نے اپنی کتاب میں کہی ہے۔ قادری صاحب نے کہا تھا:

''جن علما نے علمائے دیوبند کی تکفیر کی، وہ بھی حق بجانب ہیں اور جنہوں نے سکوت کیا، وہ بھی حق بجانب ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دلیل کی روشنی میں جس پر جو بات منکشف ہوگی، اس پر اس کا اتباع واجب ہوگا۔''

مذکورہ بالا حوالہ جات سے گزرنے کے بعد راقم کو کافی اطمینان ہوا اور وہ خلش جو اشرفیہ کے بام و در سے لے کر نکلا تھا، جاتی رہی۔

❁❁❁❁

معروضات

۲۰۰۵ء کی بات ہے، جب میں اشرفیہ سے فراغت کے بعد دہلی پہنچ چکا تھا۔ راوی کا بیان ہے:

ایک طویل القامہ، اوورکوٹ اور ہیٹ میں ملبوس، انگلش اسپیکنگ جینٹل مین کو ساتھ لے کر اشرفیہ کا ایک طالب علم (۱) اشرفیہ کے ایک ممتاز اور ذمہ دار استاذ کے کمرے میں داخل ہوتا ہے:

جی؟

حضور! یہ جرمنی میں اشرفیہ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ یہاں کے ذرائع آمدنی اور دیگر داخلی امور کے حوالے سے آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں؟

اچھا، چلو کسی اور سے ملاؤ!!

حضرت نے دروازہ بند کرلیا۔ جینٹل مین باہر آ گیا۔ بعد ازاں وہ کئی دیگر اساتذہ سے ملنا چاہا، لیکن ہر جگہ اسی سے ملتا جلتا ردعمل رہا۔ جامعہ کے ایک دوطلبہ نے اس کا ساتھ دیا۔ اسے ہاسٹل میں اپنے ساتھ رکھا، جس پر انہیں بھی انتظامیہ کی خشمگیں نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جامعہ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ جرمنی سے جاسوس آیا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے مولانا مبارک صاحب وغیرہ نے اسے سمجھا اور اس کے بعض سوالات کے جوابات دیے۔ وہ جینٹل

---

(۱) رفیق دیرینہ ڈاکٹر اشرف الکوثر مصباحی، پوکھریرا، بہار، راوی بھی خود آں موصوف ہیں۔

مین اشرفیہ سے پہلے دیوبند وغیرہ کئی بڑے مدارس ہند کا دورہ کر چکا تھا۔ دیوبند میں اسے اسپیشل مہمان خانے میں رکھا گیا تھا اور اسے اسپیشل ٹریٹمنٹ دیا گیا تھا، جب کہ اشرفیہ میں کوئی اس سے ملنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ اس زمانے میں عزیزی ہاسٹل میں جہاں نما کے نام سے طلبہ کی مقبول عام وال میگزین نکلتی تھی۔ اس میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے اس جینٹل مین نے کہا:

''اشرفیہ اور دیوبند میں فرق یہ ہے کہ دیوبند میں اساتذہ اوپن مائنڈیڈ ہیں، جب کہ طلبہ بہت نیرو مائنڈیڈ ہیں۔ ٹھیک اسی کے برعکس تمہارا اشرفیہ ہے۔ یار! تمہیں دنیا سے کوئی مطلب نہیں، کوئی بات نہیں، تم کو دین کی خدمت کرنی ہے، بہت اچھے۔ لیکن بس ایک بات بتاؤ، یہ دین کی خدمت تم کرو گے کا کہاں؟ دنیا ہی میں یا کہیں اور؟''

جناب ارشد عالم گیا بہار کے سنی خانوادے کے فرد ہیں۔ جے این یو کے بعد جرمنی چلے گئے تھے اور جرمنی سے اپنی تحقیق کے سلسلے میں اشرفیہ آئے ہوئے تھے۔ وہ کئی دنوں تک اشرفیہ میں مقیم رہے۔ اساتذہ، طلبہ اور اہل قصبہ سے تحقیقات کرتے رہے اور پھر واپس چلے گئے۔ ان کی تحقیق مدرسے پر تھی، جس میں مبارک پور کے دو مدرسے اشرفیہ اور احیاء العلوم کا انہیں خصوصی مطالعہ کرنا تھا۔

ان کی پی ایچ ڈی مکمل ہوگئی اور Inside the Madrasa کے نام سے چھپ بھی گئی۔ جرمنی سے واپسی کے بعد جامعہ ملیہ میں استاذ رہے اور ابھی فری لانس ریسرچر اور جرنلسٹ ہیں۔ کئی سالوں بعد پچھلے ہفتے ان سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے: یار! تم مصباحی لوگ بھی عجیب ہو؟ میں نے تمہارے مدرسے پر ریسرچ کی اور تم لوگ ہی اب تک اس سے بے خبر ہو۔ اِینی وے! اشرفیہ کے لیے اپنی کتاب کی ایک کاپی بھجوانی ہے۔ کوئی سبیل بتاؤ۔

یہاں پر اس رام کہانی کا شان نزول کیا ہے، یہ آپ خود طے کریں۔ ہمیں بس چند باتیں عرض کرنی ہیں:

(۱) اکیسویں صدی کے نئے حالات میں انسانیت، اسلام اور سنیت کے حوالے سے جو عالمی مسائل سامنے آئے ہیں، ان کے حل کے لیے جس بڑے ویژن کی ضرورت ہے، اس کی بنیادیں متنوع ملکی اور عالمی روابط میں پیوست ہیں۔ اس کی علت مادی ایک کھلا ذہن ہے جو مبارک پور سے بریلی، کچھوچھہ سے مارہرہ اور پیلی بھیت سے بدایوں کے

طواف سے پیدانہیں ہوسکتا۔ یہ ذہن کتاب وسنت، اجماع وقیاس اور محدثین وفقہا کے اصولوں اور صوفیہ کے اخلاقی رویوں سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے جدید دور میں جامعہ اشرفیہ سے جامعہ ملیہ، ازہر سے آکسفورڈ، بابری مسجد سے طلاق ثلاثہ، برما سے فلسطین، سعودی عرب سے ایران اور وہائٹ ہاؤس سے مجلس اقوام متحدہ تک کو نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ اشرفیہ ہندوستان میں سنی صوفی مسلمانوں کا سب سے بڑا نمائندہ ادارہ ہے، لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ عالم اسلام کے سب سے بڑے سنی صوفی ادارے جامعہ ازہر سے اب تک اس کے راست رابطے نہیں ہوسکے، جب کہ اس کے بہت سے فارغین وہاں سے پاس آؤٹ ہوچکے اور درجنوں ابھی بھی زیر تعلیم ہیں۔

مبارک پور کے پچھلے سفر میں، میں نے اشرفیہ کے ایک بہت بڑے ذمہ دار کو اس پہلو پر متوجہ کیا تو وہ کہنے لگے: اچھا! ازہر اہل سنت کا ادارہ ہے؟ اندر سے ایک آواز نکلتے نکلتے رکی: اچھا! حضور! آپ رہتے کہاں ہیں؟ حضرت نے مزید فرمایا: ہم ایک کام کررہے ہیں دوسرا کام کوئی اور سنبھالے۔ ان کا جواب بظاہر معقول تھا۔ لیکن سوال ہے کہ کیا عالمی سنی رابطے کا کام ایسا ہے جس سے ہندوستان کے اس نمائندہ ادارے کے لیے بے نیازی جائز ہو۔ شاید ہم ضرورت سے زیادہ عبدالغنی بن گئے ہیں اور یہ بھول گئے ہیں کہ اللہ الغنی وانتم الفقراء۔

میں اشرفیہ کو اکیسویں صدی کے ہندوستان میں سنی صوفی مسلمانوں کا نمائندہ ادارہ سمجھتا ہوں، یہی مستقبل میں ان کے مسلکی تحفظ کے ساتھ ان کی دینی وملی قیادت کا فریضہ انجام دے سکتا ہے، لیکن اس کے لیے مذکورہ بالا وِیژن، صفت لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) عصر حاضر کے نئے حالات میں جو پیچ دار اور ژولیدہ مسائل سامنے آئے ہیں اور فکر وعمل میں انتہا پسندی، ہوا پرستی اور دین بیزاری کا جو ماحول بنا ہے، اس کے پیش نظر دارالافتا کو حد درجہ احتیاط برتنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ امت کی رہ نمائی اور ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کا تقاضا ہے کہ دینی، ملی اور مسلکی مسائل میں کچھ بولڈ فیصلے لیے جائیں۔ ہم ویڈیو گرافی کے ساتھ اپنا فقہی سیمینار کراتے ہیں اور تصاویر کے ساتھ اس کی رپورٹ اخبار میں چھپواتے ہیں، لیکن ہمارا دارالافتا ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ ہم یہ صحیح کرتے

ہیں یا غلط کرتے ہیں؟ پروفیسر اختر الواسع اور مولانا احمد بخاری کے ساتھ ہم بیٹھ جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر طاہر القادری کے ساتھ ہم بیٹھ سکتے ہیں کہ نہیں، یہ بات ہمیں ہمارا دارالافتا نہیں بتاتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا ملی وجود اور ان کی عزت و آبرو سنگین خطرات سے دوچار ہے، ایسے میں مولانا توقیر رضا خان دیوبند جاتے ہیں اور مسلکی اختلافات کے اظہار کے ساتھ ملی مسائل میں اشتراک کے لیے علمائے دیوبند کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک چندی چور مولوی اس پر اودھم کاٹتے ہیں، لیکن ہمارا دارالافتا ہمیں نہیں بتاتا کہ مولانا توقیر رضا خاں صحیح کر رہے ہیں کہ غلط کر رہے ہیں؟ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا لینے سے طوفان رک نہیں جاتا، بگولے تھم نہیں جاتے۔(۱)

حضرت سید محمد اشرف مارہروی کے حضور بات ہو رہی تھی۔ کسی نے جماعت کے ایک بڑے مفتی صاحب کے بارے میں کہا کہ حضرت بہت پھونک پھونک کے قدم رکھتے ہیں۔ اشرف میاں مسکرائے اور اپنے مخصوص لہجے میں گویا ہوئے:

''مولانا! بلکہ یوں کہیں کہ پھونکتے زیادہ ہیں، قدم کم رکھتے ہیں۔''

یہی بات بنارس میں مفتی عبید الرحمٰن رشیدی دام ظلہ نے میرے سامنے اشرفیہ کے چند بڑے ذمہ داران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''مولانا! آپ لوگ اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟ دیکھیے میرا جو موقف ہے وہ ہے۔ میں تو نہیں ڈرتا۔ آخر آپ حضرات کے قلب میں وہ کون سا فاسد مادہ ہے جو آپ لوگوں کو ڈر کی نفسیات میں رکھتا ہے؟''

مولانا عبید اللہ خان اعظمی صاحب نے بھی ذاتی گفتگو میں بارہا اس کا اظہار کیا۔ یاد رہے کہ ڈر کی نفسیات اور قیادت کی نفسیات ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتی اور ایسا نہیں ہے کہ اشرفیہ کے ارباب حل وعقد اس عقدے سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن پھر اس ڈر کی وجہ کیا ہے؟ وہ ہم آگے بیان کرتے ہیں۔

---

(۱) یہ گفتگو بریلوی مراکز فتویٰ اور خصوصاً دارالافتا اشرفیہ کے حوالے سے ہے، گو کہ دیگر مراکز فتویٰ کا حال بھی بہت مختلف نہیں ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اشرفیہ کی جرأت بیان کو اس کی وسعت پرواز کا ہم ساز ہونا چاہیے۔

(۳) دار العلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم/ باغ فردوس (۱۳۵۳ھ) کی عمر قریب نوے سال ہوگئی۔ الجامعۃ الاشرفیہ کی عمر بھی ۲۰۱۸ - ۱۹۷۲ = ۴۶ سال ہوگئی۔ اشرفیہ اپنی تعلیمی، تصنیفی، فقہی، علمی اور اصلاحی خدمات کی بنیاد پر اس وقت سنی صوفی مسلمانوں کا مرکزی ادارہ ہے۔ اس کے باوجود اس نے اب تک income کے مستقل ذرائع پیدا نہیں کیے، جس کا نتیجہ ہے کہ بہت سے مواقع پر اشرفیہ کے ارباب حل وعقد بولڈ فیصلے نہیں لے سکتے۔ اس لیے اشرفیہ کی منتظمہ کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اشرفیہ نے اب تک میڈیکل اور ٹیکنیکل تعلیم پر بھی توجہ نہیں دی، جو حافظ ملت کے تصور تعلیم کا حصہ ہے اور جو اس زمانے میں دین وملت کی خدمت کے ساتھ ایک مستقل ذریعۂ آمدنی بھی ہے۔ اشرفیہ جب تک آمد کے مستقل ذرائع تلاش نہیں کرتا، جاہل سنی سیٹھ اس کے پہیے کو آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔

(۴) اشرفیہ کی داخلی تعلیمی پالیسیوں میں جو سختی ہے، میں اس کی خوبی کا معترف ہوں، لیکن میرا اپنا ماننا ہے کہ قانون اسلامی میں جب لچک رکھی گئی ہے تو قانون انسانی میں بھی ایک حد تک لچک ضرور ہونی چاہیے۔ زمانۂ طالب علمی میں بات بات پر بچوں کا خارجہ اور اخلاقی تربیت سے زیادہ قانونی حکمرانی اور اس قسم کے دیگر امور پر ہمارے دوست مولانا غلام مصطفی ازہری نجی مجالس میں سخت جرح وتنقید کیا کرتے تھے۔ میں ان کی باتیں سن تو لیتا تھا، لیکن خود مجھے ان کی باتیں بہت بعد میں سمجھ میں آئیں۔ اب اس قسم کی باتیں تو بہت سے خیر خواہان اشرفیہ بلکہ اساتذہ اشرفیہ بھی ہم سے نجی ملاقاتوں میں کرنے لگے ہیں۔ اصول پسندی کی اپنی اہمیت ہے اور حکمت ومصلحت کی اپنی ضرورت۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں باتوں میں بیلنس ہونا چاہیے۔

(۵) اشرفیہ کے داخلی اور انتظامی استحکام کے حوالے سے آخر میں یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ اشرفیہ سے باہر بیٹھے ہم جیسے ہزاروں نکتہ سنج فرزندان اشرفیہ، اشرفیہ کے سامنے تجاویز تو پیش کرتے ہیں لیکن اس کے استحکام کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ اس بات کا اظہار بڑے درد کے ساتھ استاذ گرامی مفتی بدر عالم مصباحی صاحب نے پچھلی ملاقات میں اشرفیہ کے دار الحدیث میں کیا۔ ذمہ داران اشرفیہ اور فرزندان اشرفیہ کے بیچ giveand take کا خوش گوار تعلق کیسے قائم ہو، طرفین کے لیے بڑا سنجیدہ اور توجہ طلب سوال ہے۔

اشرفیہ کی یادیں لکھتے لکھتے بیچ میں یہ باتیں اس لیے آ گئیں کہ ہم اشرفیہ سے محبت کرتے ہیں، اس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کے اندر مستقبل میں ہندوستانی مسلمانوں کی ملی اور معاشرتی قیادت کا جوہر پاتے ہیں۔ شکوے انہی سے ہوتے ہیں، جن سے محبت ہوتی ہے۔ جو اشخاص اور ادارے ابھی بھی بھنگ پی کر ٹن ہیں، انہیں آج کے سنگین خونی حالات ابھی بھی بیدار نہیں کر سکے ہیں، وہ آج بھی ماضی کے مسلکی طریے پڑھ پڑھ کر مست مگن ہیں، ان سے کیا شکوہ کرنا۔

آرزو، حسرت و امید ، شکایت، آنسو
اک ترا ذکر تھا اور بیچ میں کیا کیا نکلا

اگلا پڑاؤ

۲۹/اپریل ۲۰۰۲ء کو جامعہ اشرفیہ کے نامور فرزند علامہ ارشد القادری، اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہی ارشد القادری جنھوں نے مجھ جیسے ہزاروں نوجوانوں کو مثبت عملی اور تحریری راہوں میں مہمیز کیا ہے۔ افسوس کہ میری نگاہیں ان کی زیارت سے محروم رہیں۔ یہ سادسہ، یعنی عالمیت کا سال تھا۔ ان کے عرس چہلم کے موقع پر رئیس القلم نمبر کے نام سے جام نور کا پہلا ضخیم شمارہ جون تا ستمبر ۲۰۰۲ء منظر عام پر آیا۔ پہلا عام شمارہ اکتوبر کا آیا جو اپنے اداریے، مواد، اسلوب اور پیش کش کی انفرادیت کے سبب اول روز ہی عوام وخواص میں چھا گیا۔ پورے ملک میں اس کی مقبولیت مسلم تھی، البتہ اشرفیہ میں اس کی مقبولیت کا الگ ہی رنگ تھا۔ رفیق گرامی ظفر الدین برکاتی اس کی کاپی ۲۵۰ کی تعداد میں منگاتے تھے اور سارے شمارے ہوٹ کیک کی طرح ہر ماہ فروخت ہوجاتے۔ ابتدائی چند شماروں کے بعد ہی میں نے خوشتر صاحب کو تفصیلی خط لکھا، جس کا انہوں نے اسی تفصیل سے جواب دیا اور ہمارا غائبانہ ربط قائم ہوگیا۔ غالباً پہلے ہی خط میں خوشتر صاحب نے عندیہ دیا تھا کہ آپ فارغ ہوجائیں تو ساتھ میں مل کر کام کیا جائے۔ اپریل ۲۰۰۳ء سے ''تربیت گاہ لوح وقلم'' کے نام سے طلبہ کے لیے ایک نئے کالم کا آغاز ہوا اور اس میں راقم السطور کی تحریر ''اسلام اور عہد حاضر کا چیلنج'' شائع ہوئی۔ پھر مکاتیب ومضامین کی اشاعت کا سلسلہ چل نکلا۔ اواخر جولائی ۲۰۰۳ء میں عرس حافظ ملت کے موقع پر خوشتر صاحب اشرفیہ آئے اور ہماری ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ جام نور کیسا چل رہا ہے؟ جواب تھا:

''کیسا چل رہا ہے؟ بس! آپ جلدی سے فارغ ہوکر دہلی آجایئے، ان شاء اللہ پھر ساتھ میں مل کر کام کرتے ہیں۔''

اواخر ستمبر ۲۰۰۴ء میں اشرفیہ کو الوداع کہہ کر دہلی پہنچا۔ جب ہماری ٹرین دہلی پلیٹ فارم پر پہنچ رہی تھی، میرے قلم سے اشرفیہ کے ۶ رسالہ سفر کی مختصر روداد مکمل ہو رہی تھی۔ میں نے چار پانچ صفحات میں اپنی اب تک کی زندگی کو لکھا تھا۔ آخری سطور میں، میں نے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ اشرفیہ کے یہ ۶ رسال اب تک کی زندگی کے عزیز ترین لمحات تھے۔ اب زندگی مجھے کہاں لے جائے گی، مجھے نہیں معلوم۔

دہلی پہنچ کر دو تین دنوں بعد خوشتر صاحب کو فون کیا۔ انھوں نے فوراً ملنے کے لیے بلایا۔ دوسرے دن جام نور کے دفتر پہنچا۔ خوشتر صاحب نے حسب عادت شاندار ضیافت فرمائی، ایک طویل تمہیدی تقریر کی اور پھر اپنے مدعا پر آ گئے: ''دیکھیے! آپ کا مقصد دہلی کی جامعات میں اعلیٰ تعلیم کا حصول جاری رکھنا ہے۔ اسے جاری رکھیں۔ میں آپ کی تائید کرتا ہوں۔ ساتھ میں کچھ وقت ہمیں بھی دیں۔ چوں کہ معاملات کی بات ہے اس لیے آپ ہمیں ہر ماہ ایک ہفتہ دیں گے اور شروع میں ہم آپ کو ۲۰۰۰ روپئے دیں گے، جس سے آپ کو تعلیمی سفر میں بھی آسانی رہے گی۔ پھر بعد میں اس میں اضافہ کیا جائے گا۔''

خوشتر صاحب نے اپنی ساری باتیں ایک سانس میں ہی کہہ ڈالیں۔

ابھی کچھ دنوں مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔

سوچنا کیا؟ جو کل کرنا سو آج کیجیے۔

اچھا! تو فی الوقت میرا نام نہ دیں!

ارے جب کام کرنا ہی ہے تو توقف کیسا؟

اچھا! اگر آپ نام دے ہی رہے ہیں تو میرا نام محمد ذیشان احمد لکھیں۔ یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ میرا نام ذیشان ہے اور شروع اور آخر میں حضور نبی کریم ﷺ کے اسمائے مبارکہ باعث برکات ہیں۔ میرے نام کے ساتھ مصباحی مت لکھیے گا۔

آخری جملے کے پیچھے میرے دو arguments تھے۔ ایک تو یہ کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا نام میری فکر کا عنوان بن جائے اور کوئی بھی قاری مجھ کو پڑھنے سے پہلے ہی میرا

مسلک متعین کر لے۔ دوسری بات یہ کہ میں طبعاً ضدی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے مجھ سے جانیں، کسی اور تعارف یا نسبت سے نہ جانیں۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ میری تحریر میں طاقت ہوگی تو کسی اضافی شناخت کے بغیر بھی وہ اپنی شناخت بنالے گی اور اگر اس میں طاقت نہ ہوگی تو کوئی بھی نسبت اور کوئی بھی تعارف اسے اعتبار بخشنے سے قاصر ہوگا۔لیکن خوشتر صاحب نے میری بات نہیں مانی۔ جب رسالہ چھپ کر آیا تو اس میں میرا نام ''ذیشان احمد مصباحی'' تھا۔اب یہی میرا قلمی نام بن گیا۔

یہاں سے میرا دہلی کا سفر شروع ہوا۔ ۲۰۰۷ء سے خانقاہ عارفیہ سے شناسائی ہوئی۔ ۲۰۱۲ء سے یہاں کا مستقل جاروب کش ہوگیا۔ دہلی جانے کے بعد دہلی چھوڑنے کا ارادہ نہیں تھا اور یہاں الہ آباد آنے کے بعد اب اسی خاک میں مرنے کی آرزو ہے۔ باقی اللہ مالک! کل کس نے دیکھا ہے۔انسان کے دل میں ہر دن ہزاروں خواہشیں پیدا ہوتی ہیں اور ہر دن مرتی اور دفن ہوتی ہیں۔

میں انسان ہوں۔ ہر دن کچھ نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور فکر ونظر پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں۔لیکن میری بنیادی سرشت وہی پہلے والی ہے،جس میں خودداری والد سے آئی ہے اور انسانیت،امت، دین، مسلک اور مشرب کی خمیر، خاک اشرفیہ سے اٹھی ہے۔ جزوی ترمیمات سے قطع نظر دہلی میں اس فکر کے بال و پر نکلے اور الہ آباد پہنچ کر اسے سلیقۂ پرواز ملا۔ ویسے میرا اور تیرا کیا، فی الواقع سب کچھ تو اسی کا ہے۔

سب کمال نگہِ ساقی مے خانہ ہے
موج مے ہے، نہ صراحی ہے، نہ پیمانہ ہے

❁❁❁❁

پیش منظر

پردہ گرتا ہے!

اشرفیہ سے میرا تعلق کچھ جذباتی نوعیت کا ہے۔ اس کی محبت اور عظمت کا احساس میرے رگ و پے میں پیوست ہے۔ یہ تحریر بھی دراصل اسی لطیف احساس کا ایک ناقص اظہار ہے۔ اس کے لیے میرے خفتہ جذبات کو قارئین ہر ہر لفظ میں محسوس کریں گے۔ ہم نے اپنی حد تک اس باغ علم وحکمت کا ولولہ انگیز ذکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض احباب اس میں مسجع القاب اور مقفیٰ عبارات کی کمی محسوس کریں گے۔ میری گزارش ہے کہ- خدانخواستہ- اسے اس بام ودر کی تقصیر یا اس کے اساتذہ و منتظمین کی تحقیر پر محمول نہ کریں۔ اسے ادبی سلاست اور علمی سادگی کی مجبوری سمجھیں۔

اسی طرح ہم نے دل کشی اور شگفتگی پیدا کرنے کی غرض سے اس میں مزاح لطیف کا اسلوب رکھا ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ اس مزاح میں طنز کا دور دور تک گزر نہیں ہے۔ میں اپنی مادر علمی اور اس کے اساتذہ و منتظمین یا اپنے احباب ورفقائے کار کے لیے ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔

مزاح کے علاوہ اس میں اپنے اور اپنے گردوپیش کے بعض احوال وافکار کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ تجزیہ خالصۃً لوجہ اللہ ہے۔ اس میں لغزش وخطا کے امکانات سے انکار نہیں کیا جاسکتا، البتہ یہ بات حلفیہ کہی جاسکتی ہے کہ اس میں کسی تعصب یا مکر کا دخل نہیں ہے۔ یہ سب قلبی خواطر ہیں، جنہیں بلاکم وکاست سپرد قلم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں اشرفیہ کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں بعض ناقص مشورے بھی دیے گئے ہیں۔ ان مشوروں کے پیچھے بھی ''باغ فردوس'' کی تنقید ہرگز مقصود نہیں، بلکہ نیت یہ ہے کہ

اس وسیع وعریض ادارے کو۔شعوری یا غیر شعوری طور پر۔جن بعض مقامی تنگنائیوں میں محبوس رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ ان سے باہر نکلے اور اسلام وسنیت کا آفاقی ترجمان بنے۔

یہ تحریر ۱۳؍فروری ۲۰۱۸ء سے ۷؍مارچ ۲۰۱۸ء تک فیس بک پر ۱۷؍قسطوں میں شائع ہوئی۔اب چار سالوں بعد نظر ثانی اور بعض جزوی ترمیم واصلاح کے ساتھ آپ کی خدمت میں کتابی صورت میں حاضر ہے۔میرے ایک دوست کو اپنے ذکر پر تھوڑا شکوہ تھا۔غالباً انہوں نے مزاح کے بعض جملوں کو طنز پر محمول کرلیا تھا، اس لیے ان کے لیے میں نے ایک فرضی نام وضع کرلیا ہے۔امید کہ وہ اب مجھے قابل معافی سمجھیں گے۔ان کے علاوہ بھی ان تمام احباب کی خدمت میں پیشگی معافی کا خواست گار ہوں جن کے آبگینوں کو میرے بعض الفاظ وعبارات سے ٹھیس لگتی ہوئی محسوس ہو۔

مولیٰ کریم سے دعا ہے کہ وہ داتا کریم میری اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے اور اسے اصلاح افکار واحوال کا ذریعہ بنائے۔آمین!

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا بفضل سيدنا ومولانا محمد وآله وصحبه وبارك وسلم تسليما كثيرا۔

❁❁❁❁

تاثرات

یہ تحریر ۱۳؍فروری ۲۰۱۸ء سے ۷؍مارچ ۲۰۱۸ء تک فیس بک پر ۱۷؍قسطوں میں شائع ہوئی۔ احباب نے اپنے کمینٹس میں دل کھول کر اس کی تحسین فرمائی۔ یہاں ان میں سے بعض اہم تبصرے حاضر ہیں۔ مصباحی

مولانا حسین سعید صفوی (سید سراواں)

آپ کی یہ قسط وار تحریر بعنوان ''وہ خلد بریں ارمانوں کی'' پڑھ کر بہت لطف ملتا ہے اور بار بار پڑھنے کا دل چاہتا ہے۔ قوت حافظہ، انداز بیان، استعارہ، کنایہ، اسلوب، لہجہ، ماضی پر تبصرہ، حال کا تجزیہ، ہر چیز قابل تحسین ہے۔ سچ کہوں تو الفاظ نہیں جن سے آپ کی شایان شان تعریف کرسکوں۔ اللہ رب العزت آپ کو اور آپ کے قلم کو تادیر قائم ودائم رکھے!

ڈاکٹر خوشتر نورانی (امریکا)

ماشاءاللہ بہت عمدہ سلسلہ ہے۔ میں بہت لطف لے کر پڑھ رہا ہوں۔ یادرفتگاں کو قلم بند کرنے میں جو بے تکلفی اور برجستگی ہونی چاہیے، آپ کا یہ سلسلہ ان خصوصیات سے مالا مال ہے۔ دراصل یہی ادب ہے، ورنہ بعض حضرات کی ادق تحریر پڑھ کر کئی دنوں تک امتلائی کیفیت بنی رہتی ہے۔ بہت خوب، پڑھ کر بہت محظوظ ہوا اور ایسا لگا۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلّی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

مولانا سید سیف الدین اصدق (جمشید پور)

علامہ ظفر ادیبی صاحب مرحوم سے اسی طرح کا انٹرویو کبھی ہمارے برادر اصغر مولانا نور الدین اصدق نے بھی لیا تھا بلکہ اس سے بھی تفصیلی اور قیمتی مگر چونکہ قرطاس وقلم سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں اس لیے بڑی اہم باتیں سامنے نہ آسکیں۔ اگر کبھی ان سے بات ہو تو ضرور معلوم کرنے کی کوشش کریں گے، شاید انھیں اب بھی کچھ یاد ہو۔

حضرت مفتی عبید الرحمن رشیدی صاحب نے یہ بات مجھے بھی تفصیل کے ساتھ بتائی تھی۔ اور ہاں! ادھر دو اپی سوڈ سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ آپ کے سارے پرانے ساتھی دور دور تک نظر نہیں آرہے ہیں۔ واقعی اس نازک مسئلے پر گفتگو کرنا کفر کے سلاٹر ہاؤس ہی میں پہنچنا ہے۔ اس لیے میں بھی اپنا ایمان بچائے گھومتا ہوں۔ ویسے کسی مضمون سے قبل اپنے رفقا کو آپ یہ شعر لکھ کر ضرور بھیج دیا کریں:

انہیں پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اپنے کسی ہم جماعت کی ایسی فراخ دلانہ تعریف، آپ کی وسعت ظرفی کا پتہ دیتی ہے۔ واقعی مولانا [غلام مصطفیٰ ازہری] کی شخصیت مسحور کن ہے۔ صوفی کانفرنس کے دوران ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا اور میں بے حد متاثر ہوا۔ اللہ انھیں سلامت رکھے۔

'اسلامی حکومت سٹھیاؤں تک آچکی ہے'، اس جملے نے تو سارا ذہنی بوجھل پن ہی دور کر دیا۔ نئی دنیا کے بارے میں بالکل درست تبصرہ ہے، کبھی میں بھی اس کا پابندی سے مطالعہ کرتا تھا، مگر شعور آتے ہی توبہ کی۔

بہت اچھا جا رہے ہیں، پورا احوال دل وال پر رکھ ہی دیں، کوئی بعید نہیں کہ آنے والے دنوں میں اس آب بیتی کو کہیں ادب کے نصاب میں شامل کر دیا جائے۔

مولانا سید قمر الاسلام (علی گڑھ)

اگر قسطوں میں اپنے قارئین کو مارنا بلکہ مرنے کا اس قدر شوق جگا دینا کہ وہ خود بخود سر بکف قاتل کی راہ تکنے لگیں، کسی ادیبانہ شان کا حصہ ہے تو میری رائے میں محترم ذیشان احمد مصباحی واقعی ذیشان ہیں۔ اللہ سلامت رکھے۔

احمد تراث (لاہور)

بہت خوب لکھ رہے ہیں، جناب! میرا خیال ہے کہ یہ آج کے مدارس کے اندرونی احوال کے بارے میں پہلی باقاعدہ تحریر ہے، اس کو مزید وسعت دینی چاہیے، مزید واقعات کا اضافہ کرنا چاہیے اور اسید الحق صاحب کی خیر آبادیات کی طرز پر ایک کتاب کی شکل میں سامنے لایا جانا چاہیے۔ اگر کسی اور نے یہ تجویز و فرمائش نہیں رکھی تو یہ خاکسار محبت بھرے اصرار کے ساتھ اس کی درخواست کرتا ہے۔

اس مضمون کی سب قسطوں میں آپ کے اسلوب اور زبان و بیان کا بھی اپنا جادو ہے جو قاری کو پلک بھی جھپکنے نہیں دیتا۔ ہم پنجاب والوں کو اردو نہیں آتی، نہ ہی آسکتی ہے اور اب نیرنگی دوراں سے پنجابی بھی ہماری دسترس میں نہیں ہے، لیکن آپ نے اردو اور اردو بولنے والوں کی باہمی گفتگو کے خاص انداز کی جھلک بھی بہت خوب صورتی سے دکھائی ہے، جس کے سبب اردو اور اردو بولنے والوں سے الفت اور مانوسیت بڑھ گئی ہے۔ 'بوکا ہوکا' اور 'چل پہلے تو کر' تو بھولتا ہی نہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر وہ سب مخفی باتیں زیب قرطاس کی ہیں جن کا منظر عام پر لانا باعث عار اور بے ادبی سمجھا جاتا ہے۔ یہ بہت امید افزا بات ہے۔ زندگی خوب صورت ہے، دور طالب علمی اس سے بھی زیادہ حسیں ہے، اس کی یادوں کو ایسے ہی انجوائے کرنا چاہیے اور ساتھ ساتھ، تلخ و شیریں سب کو موضوع گفتگو بنانا چاہیے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یہاں بھی زندگی دھنک کے سات رنگوں میں رنگی ہوئی ہے، مگر آپ کا کمال یہ ہے کہ جہاں کوئی تلخ بات آتی ہے وہاں آپ کا انداز بیاں اور شیریں ہو جاتا ہے۔

میرا خیال ہے میں کچھ زیادہ لکھ گیا ہوں، کہیں تبصرہ مضمون سے بڑا نہ ہو جائے، ورنہ داد و تحسین کے کئی پھول باقی ہیں، جو آپ کے عمامے میں سجائے جا سکتے ہیں۔

مفتی مبشر رضا (پورنیہ)

ذیشان صاحب بہت عمدہ لکھتے ہیں، اس پر مجھے حیرت نہیں ہے کیوں کہ وہ اس سے اور اچھا لکھنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ تعجب اس پر ہے کہ ماضی کی داستان حال کی طرح ذہن میں محفوظ کیسے ہے! واہ، مزہ آ گیا۔

مولانا ناصر رام پوری مصباحی (رام پور)

ارے حضرت! آپ چاہ کیا رہے ہیں؟ اتنا سچا اور اچھا لکھ رہے ہیں کہ پڑھنے والوں کو دیوانہ بنائے دے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ نے کچھ اور دنوں تک یہ سلسلہ جاری رکھا تو فیس بک سے باہر کے لوگ بھی کہنے لگیں گے کہ ذرا ہمیں بھی تو سناؤ کیا لکھ رہے ہیں۔ اللہ آپ کے فکر و قلم کو مزید پختہ کرے اور اشرفیہ کو مزید علم و فیض رساں بنائے۔

چوں کہ مسلسل کئی تحریریں دل چسپ آ گئیں تو لگتا ہے کہ بات طویل ہو رہی ہے، ایسے میں اگلی قسط میں یہ لطف کیسے برقرار رہے گا، یعنی لگتا ہے کہ اب تکلف کی بے مزگی شروع ہوگی، مگر ہر صبح نئی قسط میں خیالات کے سارے شیش محل ٹوٹ جاتے ہیں۔

تحریر ہر دن اتنی اچھی لگ رہی ہے کہ کہاں تک تعریف کریں، تھکنے سے لگے۔ لہٰذا کسی دن خراب لگی تبھی بھرپور ٹائپ کا کمنٹ کریں گے۔ اب تعریف نہیں ہو رہی ہم سے۔

مولانا سید نور الدین اصدق (بہار شریف)

بہت خوب جناب ذیشان مصباحی صاحب! یہ میرے بعد کا واقعہ ہے۔ تفصیل کا علم آپ کی تحریر سے ہوا۔ غضب کی منظر کشی اور اعتدال تحریر میں ہے۔ انتظامیہ اور داعیان اسٹرائک دونوں کو مجروح ہونے سے بچایا گیا ہے۔ واہ واہ!!

ذیشان مصباحی صاحب کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ ''یاد ماضی عذاب ہے یارب'' کی جگہ کہا جائے ''یاد ماضی کباب ہے یارب!

ڈاکٹر مشاہد رضوی (مالیگاؤں)

آپ سے کچھ مسائل میں اختلافات کے باوجود آج کی یہ قسط بالتفصیل پڑھی، لطف اندوز ہوا، جزوی تعبیری اختلاف کے ساتھ خوب ہے۔

ہمارے مرکزِ عقیدت خانوادۂ برکاتیہ کی خدمات عہد حاضر میں یقیناً آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اللہ ہماری اس عظیم خانقاہ کو سلامت رکھے، آمین!

ڈاکٹر اکرم رضا (پٹنہ)

ڈاکٹر صاحب! آپ نے تو حق ادا کر دیا۔ اشرفیہ کی علمی اور سیاسی سرگرمیوں کو خوب صورت انداز میں قرطاس قلم کرنے پر لکھ لکھ بدھائی ہو۔

مولانا سلیم امجدی ناگوری (راجستھان)

پورا پڑھ ڈالا۔آپ کی تحریریں قارئین کو باندھ کر رکھ دیتی ہیں۔مجال ہے بنا مکمل تحریر پڑھے کوئی چلا جائے۔خیر اشرفیہ کی یادیں تازہ ہوگئیں۔اللہ عزوجل آپ کو سلامت رکھے۔لکھتے رہیے لکھتے رہیے۔آپ خودداری اور ایمان داری سے لکھتے ہیں اور حق واضح کرتے ہیں۔

مولانا خالد ایوب مصباحی (راجستھان)

ذیشان بھائی! جب ذکر یار چھڑ گیا ہے تو اب تشنہ کیوں رکھتے ہیں، اس کو انجام تک پہنچا دیجیے۔فکری اور نظریاتی پہلوؤں پر ضرور گفتگو کیجیے تا کہ کچھ اصلاح ہو یا کم از کم خیال تو آئے۔یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آپ کی جتنی فکری رسائی ہے، دوسروں کی پہنچ نہیں اور شاید نہ آس پاس میں کسی کے پاس آپ کا بے باک مگر جامع لہجہ ہے۔

ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کی تحریر ضرور اثر انداز ہوگی۔

مفتی محمد کمال الدین اشرفی مصباحی (رائے بریلی)

ذیشان بھائی! اشرفیہ کے دور طالب علمی کی داستان لکھنے کا آپ نے حق ادا کر دیا۔ماضی کی یاد بھی تازہ ہو رہی ہے اور لطف بھی حاصل ہو رہا ہے اور آپ کی یادداشت پر رشک بھی ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ میرا بھی عینی مشاہد ہے، لیکن احتیاط سے کام لیجیے گا۔

پیرزادہ محمد طاہر (کشمیر)

جزاک اللہ خیراً!

کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی!!

ڈاکٹر شاکر عالم مصباحی (دال کولا)

ماشاء اللہ! بہت عمدہ تحریر۔اتنا سچا اور اچھا لکھتے ہیں! اللہ آپ کے فکر و قلم کو مزید پختہ کرے۔آمین!

مولانا نور الہدیٰ مصباحی (مہراج گنج)

زبردست ترجمانی واہ! آپ کا مضمون پڑھ کر ایسا لگا کہ آج بھی باغ فردوس اشرفیہ کا بام و در نگاہوں کے سامنے ہے۔سبھی قسطوں کو کتاب کی شکل میں لائیں۔جاری رکھیں۔

مولانا نورالدین محمد ازہری (جھارکھنڈ)

دل باغ باغ ہوگیا حضرت پڑھ کر۔ ماشاءاللہ! آپ نے سو فیصد درست لکھا اور میں آپ کی جملہ آرا سے مکمل اتفاق رکھتا ہوں۔ اللہ جملہ متعلقین اشرفیہ کا سایہ امت پر دراز فرمائے اور بالخصوص سربراہ اعلی کو عمر خضر عطا فرمائے۔

مولانا شبیر حسین ازہری (گجرات)

بہت بہت شکریہ ہم قارئین کی طرف سے، اس قسط وار آپ بیتی کے لیے، ہم مصباحیوں کے ان احساسات کو زبان دینے کے لیے جن کو اکثر الفاظ کا پیرہن نہیں ملتا اور وہ ہم میں چھپتے پھرتے ہیں، اندر کے عالم میں کافی جگہ گھیرے رکھتے ہیں اور ہمیں تنگ کیے رہتے ہیں۔

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

مولیٰ قلم کی روانی سلامت رکھے!

مولانا فیاض احمد برکاتی مصباحی (لکھنؤ)

اس کو بشکل کتاب منظر عام پہ آنا چاہیے۔ کوشش کیجیے۔ اگر کسی طرح کا تعاون چاہتے ہوں تو اپنے کل سامان زندگی کے ساتھ آپ کے ساتھ ہوں۔

مولانا مکرم علی شاد سمنانی (کشن گنج)

کاش جامعہ کے ارکان تک یہ باوزن تحریر پہنچتی اور ان شاءاللہ ضرور پہنچے گی اور اشرفیہ خودمختار ہوگا، اس کی بنیادیں اور مضبوط ہوں گی، روحانی سرپرستی جو حافظ ملت کے مرشد سرکار اشرفی میاں فرمارہے ہیں۔ آج دن بھر اس تحریر کو کئی بار پڑھا، ہر بار مسرور ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ واہ سبحان اللہ!

ندیم سرور (فریدآباد)

ہر اپی سوڈ گذشتہ اپی سوڈ سے دل چسپ ہوتا جارہا ہے۔ نیکسٹ اپی سوڈ کا بے صبری سے انتظار ہے۔ عارف اقبال کے دستخط روالا واقعہ واقعی انٹرسٹینگ ہے۔

❁❁❁❁

مصنف کی اگلی کتاب

تجدید وفا

جامعہ ازہر میں دو ماہ

عنقریب منظر عام پر آ رہی ہے!